میرے پتے پہ اس خط کو وصول کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا لہٰذا ڈاک والوں نے سب ہی خط یکے بعد دیگرے راجہ کو واپس لوٹا دیئے تھے۔ میرے پاس راجہ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور پھر اگر مجھے وقت سے پہلے ہی وہ جو آپی کے اس رشتے کے بارے میں پتہ چل جاتا تو بھی میں کیا کر سکتا تھا؟؟

میں، امی اور باقی گھر والوں سے وہ جو آپی کے صحن میں مل کر واپس باہر آ گیا کیونکہ وہ جو آپی کو جس کمرے میں بٹھایا گیا تھا وہاں جانے کی مجھ میں ذرہ برابر بھی ہمت نہیں تھی لیکن کچھ ہی دیر میں عمارہ اندر سے عجلت میں باہر نکلی اور کہا کہ وہ جو آپی مجھے بلا رہی ہیں۔ میں بیٹھا رہا لیکن راجہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھا دیا اور زبردستی اندر دھکیل آیا۔ وہ جو آپی پیلے جوڑے میں ملبوس، سر جھکائے اپنی سہیلیوں اور رشتہ دار خواتین کے جھرمٹ میں یوں بیٹھی ہوئی تھیں کہ ان کے چہرے کے رنگ اور اس پیلے دوپٹے میں فرق کرنا ناممکن تھا، جو اس وقت ان کے سر پر ڈلا ہوا تھا۔ میں دروازے میں ہی رُک گیا۔ پیچھے کارنس پر میری یونیفارم والی تصویر اب تک اپنی اُسی پرانی جگہ پر سجی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر عورتوں نے دعائیں دیں اور وہ جو آپی کی کسی سہیلی نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ وہ جو آپی نے نظر اٹھائی اور مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائیں۔ ان کی اس زخمی سی مسکراہٹ کے پیچھے کتنے درد چھپے تھے یہ صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ جانے کیوں اس پل مجھے طاہر بھائی کی بہت شدت سے یاد آئی، اور ایک پل کے لیے میرے دل نے سب کچھ بھلا کر خدا سے یہ شکوہ کر ڈالا کہ اگر اس شہزادی کو کسی کے ساتھ رخصت ہونا ہی تھا تو پھر طاہر بھائی ہی کیوں نہیں.....؟ کیوں خدا نے اتنی جلدی اُنہیں اپنے پاس بُلا لیا۔ وہ جو آپی اگر آج ان کے ساتھ رُخصت ہو رہی ہوتیں تو ان کے چہرے پر اس پیلاہٹ کی جگہ کیسی چاندنی بکھری ہوئی ہوتی؟..... دنیا میں ہمیشہ سب کچھ ویسا ہی کیوں ہوتا ہے جیسا ہم نہیں چاہتے؟؟

میں پلکیں جھپکے بنا انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے شور اٹھا کہ لڑکے والے مہندی لے کر آ گئے ہیں۔ سبھی عورتیں اور لڑکیاں جلدی سے اٹھ کر باہر کی جانب لپکیں اور کچھ ہی دیر میں، میں اور وہ جو آپی کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں اندر اُن سے ملنے کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں چپ چاپ اُداس سا بیٹھا رہا انہوں نے حسب معمول اپنی انگلی سے میری ناک کو پھسا دیا، لیکن آج میرے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں ان کے بنا بہت اُداس ہو جاؤں گا۔ وہ کیوں ہم سب کو چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ جواب میں انہوں نے اپنی آنکھوں کو بھیگنے سے بڑی مشکل سے روکا اور مجھے تسلی دی کہ ایک نہ ایک دن تو انہیں اس محلے سے جانا ہی تھا، اور پھر وہ کون سا سو کوس دُور یہ شہر چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ انہیں تو اسی شہر میں ہی رہنا تھا اور یہ کہ میں جب چاہوں ان سے ملنے کے لیے آ سکتا ہوں۔ وہ جو آپی نہ جانے کتنی دیر تک ایسی ہی کئی تسلیاں دے کر مجھے بہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ انہوں نے مجھے خوب دل لگا کر پڑھنے کی بھی تلقین کی اور اپنی الماری کی دراز میں سے مجھے وہ سب چیزیں بھی اٹھانے کو کہا جو وہ ہمیشہ کی طرح میرے لیے، میری غیر موجودگی میں جمع کر کے رکھتی رہتی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج ان سے جی بھر کر باتیں کر لوں کیونکہ کل سے تو وہ پرائی ہونے والی تھیں لیکن یہ خواہش بھی میرے دل میں حسرت بن کر ہی رہ گئی اور کچھ ہی دیر میں لڑکے والیاں مہندی لے کر اندر کمرے میں آ گئیں اور اتنا رش ہو گیا کہ مجھے مجبوراً کمرے سے باہر نکلنا پڑا۔

باہر راجہ پہلے سے میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں مہندی کے گیتوں کے اس شور شرابے سے دُور ہٹ کر بیٹھ گئے اور راجہ نے مجھے شروع سے ساری بات بتائی کہ کس طرح رشتے کرانے والی خالہ نے سکینہ خالہ کو یہ رشتہ بتایا تھا اور پھر جواب میں وہ جو آپی کی تصویر اس لڑکے کو دکھائی تھی

جو تصویر دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھا تھا۔

لڑکے کا نام ظفر تھا اور وہ گاڑیوں کے شوروم کا کاروبار کرتا تھا۔ بقول رشتے والی خالہ ''ظفر میاں تو ہر روز ایک گاڑی بیچتے اور دوسری خریدتے ہیں۔''..... اس وقت بھی مہندی لگانے والی خواتین نئے ماڈل کی تین چار کاروں اور ایک بڑی بس میں بھر کر آئی تھیں۔

ظفر کو اب خود اس رشتے کی اس قدر جلدی تھی کہ وہ جلد از جلد اس معاملے کو نپٹانا چاہتا تھا۔ وہاں اُنکو کا معاملہ بھی دن بہ دن لمبا ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور صدر کی جانب سے اُس کی درخواست کا کوئی جواب بھی تین ماہ گزرنے کے باوجود اب تک نہیں آیا تھا لہٰذا رشتے والی خالہ کے اصرار پر کہ لڑکا اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ سکینہ خالہ نے سر ہتھیلی پہ رکھ کر غیاث چچا کے سامنے رشتے کی بات چھیڑ ہی دی۔ شروع میں تو غیاث چچا نے انتہائی سختی سے منع کر دیا کہ فی الحال انہیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے اور یہ کہ ان کی بیٹی ان پر بوجھ تو نہیں کہ اُسے یوں جلد بازی میں گھر سے رخصت کر دیں لیکن پھر دھیرے دھیرے جیسے جیسے دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینے میں بدلتے گئے تو رفتہ رفتہ غیاث چچا کے لہجے کی سختی بھی دم توڑنے لگی البتہ ڈھو آپی کا جواب اب بھی وہی پہلے دن والا ہی تھا اور انہوں نے ایسے کسی موضوع پر بات کرنے سے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

سکینہ خالہ نے ہزار کوششوں کے بعد غیاث چچا کو کم از کم اس بات پر تو راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ ایک بار لڑکے سے مل تو لیں۔ اس کی چھان پھٹک کروا لیں کیونکہ آج نہیں تو کل، آخر کبھی نہ کبھی تو انہیں اپنی بیٹی سے رخصت کرنا ہی ہوگا تو پھر اس کام کی ابتدا کرنے میں کیا حرج ہے؟؟ اُنکو کے کیس کی وجہ سے جو بدنامی ہو چکی تھی اس کے بعد تو اتنے اچھے رشتے کا آنا ہی کسی غیبی امداد سے کم نہیں تھا لہٰذا سکینہ خالہ کی نظر میں اب مزید دیر کرنا خود اپنی جاگی قسمت کو سلانے کے مترادف ہوتا۔ آخر کار چوتھے ماہ جا کر غیاث چچا نے اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی کہ وہ خود کسی بہانے بازار سے گزرتے ہوئے لڑکے کے شوروم پر دو گھڑی رُک کر اس کا آگا پیچھا دیکھ آئیں گے اور اگر انہیں لڑکا مناسب لگا تو پھر اس کے بعد آس پاس سے اس کے متعلق خبر لینے کی کوشش بھی کریں گے کیونکہ لڑکے کا اپنا کوئی بزرگ تو تھا نہیں جس سے بات کی جا سکتی ہو۔

دراصل غیاث چچا معاملے کو اتنے دن تک اس لیے بھی لٹکاتے آ رہے تھے کیونکہ انہیں اب بھی اپنے بھائی کے بڑے بیٹے جاوید کی طرف سے کچھ امید تھی۔ جاوید دواؤں کی کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا اور غیاث چچا کی عزت بھی بہت کرتا تھا لیکن جب انہوں نے اپنے بھائی محمود سے ڈھو کے لیے آئے رشتے کا سرسری سا تذکرہ کیا تا کہ وہ محمود اور جاوید کی مرضی جان سکیں تو دونوں نے بیک وقت غیاث چچا کو مشورہ دیا کہ اگر رشتہ مناسب ہے تو دیر نہ کریں۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ ان کے بھائی کا گھرانہ ڈھو آپی کو اپنانے کی مزید کوئی خواہش نہیں رکھتا، حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب اسی بھائی کے غیاث چچا کے گھر چکر لگاتے ہوئے جوتے نہ گھستے تھے۔ لیکن اب وہی ڈھو آپی ان کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ اتنے واضح اشارے کے بعد غیاث چچا کی کمر بھی ٹوٹ ہی گئی اور انہوں نے سکینہ خالہ کو اختیار دے دیا کہ وہ جیسے مناسب سمجھیں، پیش رفت کر گزریں البتہ واحد شرط انہوں نے ڈھو آپی کی رضامندی سے مشروط رکھی کیونکہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی مرضی کے خلاف اب بھی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔

ڈھو آپی کچھ عرصہ تو خون کے گھونٹ پی پی کر اپنی ماں کی پریشانی اور باپ کی دن بدن جھکتی ہوئی کمر کو دیکھتی رہیں لیکن پھر ایک دن جب انہوں نے اپنے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں وہ نمی دیکھ لی جس کا باعث وہ صرف اپنی ذات کو ہی سمجھتی تھیں تو اسی لمحے انہوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ

کرلیا اور چپ چاپ سکینہ خالہ سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ غیاث چچا نے اپنے طور پر لڑکے کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل کرنا تھیں وہ پہلے ہی کر چکے تھے اور بظاہر لڑکے کے بارے میں سب اچھا ہی کی رپورٹ تھی۔ لہٰذا اب مزید دیر کرنے کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی جواز۔ لڑکے کو ہری جھنڈی دکھا دی گئی اور ظفر نے اگلے ہی مہینے بارات لانے کی خواہش ظاہر کر دی اور یوں جس کے نتیجے میں آج اس کے نام کی مہندی ڈو آپی کے ہاتھوں میں سج رہی تھی۔

راجہ یہ تمام داستان سنانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا بلکہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ آس پاس بھی منظر، ہر ذی روح ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہو۔

اگلے دن بارات بھی اپنے وقت پر آ گئی۔ میں نے دُور ہی سے ظفر کو دیکھا۔ کوئی بات بھی تو خاص نہیں تھی اس کی، عام سی شکل وصورت کا ایک تیز طرار سا مرد..... جسے وہاں سب ''لڑکا'' قرار دینے کی اپنی سی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی بڑی سی لٹکتی مونچھوں نے اسے میرے نزدیک مزید پُراسرار بنا دیا تھا۔ لیکن جانے وہاں سب عورتیں اس کے واری صدقے کیوں ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پھر ڈو آپی کے مقابلے میں تو بالکل ہی چمار دکھائی دیتا تھا۔ کہاں ڈو آپی کا چاند سا مکھڑا اور کھلتا گلابی رنگ اور کہاں یہ گہرے سانولے رنگ کا کاروباری سا شخص.....؟

بہرحال ڈو آپی کی قسمت کا دھاگہ اب ظفر سے بندھ چکا تھا اور رُخصتی کے وقت پورے محلے نے فرداً فرداً ڈو آپی کو دعائیں دے کر رُخصت کیا۔ سکینہ خالہ قرآن شریف سے نیچے گزارتے وقت ڈو آپی سے مل کر جو پھوٹ پھوٹ کر روئیں تو سارے محلے کو آبدیدہ کر گئیں۔ غیاث چچا ڈو آپی کو تھامے دولہے کی گاڑی تک یوں چلتے ہوئے گئے کہ مجھے خود ان کے گر جانے کا دھڑکا لگا رہا۔ میں دُور کھڑا رہا کیونکہ اس الوداع کی ہمت میرے اندر کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ ڈو آپی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے روتی ہوئی آنکھوں سے پلٹ کر ہم سب کی طرف دیکھا۔ بے خیالی میں میرا ہاتھ انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھ گیا۔ ڈو آپی کی مجھ سے نظر ٹکرائی۔ میں نے روتے روتے اپنی ناک کو اپنی انگلی سے دبا دیا۔ آنسوؤں کا ایک فوارہ ڈو آپی کی آنکھوں سے بہہ کر ان کے پورے چہرے کو بھگو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ گاڑی چل پڑی، اندر عورتوں کے درمیان بیٹھی ڈو آپی نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ یہ میری زندگی کا دوسرا الوداع تھا جو مجھے خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے دل میں کہا۔

''الوداع اے شہزادی..... الوداع.....''

پہلی ٹرافی

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

اسفر جو فل بیک پر کھڑا تھا، اس کی زوردار کِک نے فٹ بال کو ہوا میں سینکڑوں فٹ اڑاتے ہوئے میرے قدموں میں لا پھینکا۔ میں سنٹر آؤٹ کی جگہ سے فٹ بال کو لیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔ پیچھے سے ہمارے گول کیپر موٹے آصف بھٹی کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ''آدی..... دائیں کو پھینک..... دائیں کو پھینک دے..... جلدی کر۔'' دائیں پر مجید چھوٹو چیخ کر آگے بڑھا، میں نے لیفٹ آؤٹ پر فیصل کی طرف بال پھینکنے کا جھاکا دیا اور جب مخالف ٹیم کا سنٹر آؤٹ فیصل کی جانب لپکا تو میں نے فٹ بال مجید چھوٹو کی جانب پھینک دیا۔ مجید چھوٹو نے بال سنبھالا اور تیزی سے ڈی کی طرف دوڑا۔ میں نے چلا کر اسے بال دوبارہ سنٹر کی طرف پھینکنے کا کہا لیکن اتنے میں لیاقت ہاؤس کے فل بیک نے تاک کر فٹ بال کی جگہ مجید چھوٹو کو گھما کر پوری قوت سے لات ماری اور مجید چھوٹو اگلے ہی لمحے فضا میں کسی جہاز کی طرح اڑتے ہوئے گراؤنڈ سے ہی باہر جا گرا۔ ہم نے چلا کر ریفری سے احتجاج کیا۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ ہمارا کوئی بھی کھلاڑی گیند گول پوسٹ کے قریب لے کر پہنچتا تو لیاقت ہاؤس کے کیڈٹس کوئی نہ کوئی فاؤل کر کے ہمارے کھلاڑی کو روک لیتے تھے۔ مجید چھوٹو پھوٹا سا گراؤنڈ کے باہر پڑا ہوا تھا۔ ہمارے کیپٹن صفدر نے اسے مسل کر اور مالش کر کے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کیا اور کھیل پھر سے شروع ہو گیا۔

آج بارہویں جماعت کے کیڈٹس کے درمیان انٹر ہاؤس فٹ بال ٹورنامنٹ کا فائنل تھا اور فائنل میں محمد بن قاسم ہاؤس کی بارہویں جماعت یعنی ہماری ٹیم اور لیاقت ہاؤس کی ٹیم کے درمیان آخری معرکہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن پہلے پندرہ منٹ میں ہی لیاقت ہاؤس کی ٹیم نے ہمارے تین کھلاڑی زخمی کر کے گراؤنڈ سے باہر بھیج دیئے تھے۔ ہمارا کیپٹن صفدر ان کا چوتھا شکار بنا اور اب ہم بنا کیپٹن کے گراؤنڈ میں موجود تھے۔ صفدر کی گھٹنے سے نیچے کی ہڈی چٹخ گئی تھی اور سوجن کے مارے اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ گراؤنڈ کے باہر کیڈٹس کی بھیڑ میں قاسم ہاؤس کے کیڈٹس کے چہرے پر مایوسی چھا رہی تھی میں، فیصل اور اسفر اپنے فل بیک خالد لمبے اور شار روندو کے پاس بھاگتے ہوئے آئے۔ ہم پانچوں نے سر جوڑے اور میں نے دھیرے سے فیصلہ دے دیا۔ یہ میرا یعنی وائس کپتان کا حتمی فیصلہ تھا۔ ''اب لیاقت ہاؤس کی ٹیم میں سے کوئی بھی ہماری ڈی تک صحیح سلامت نہیں پہنچنا چاہیے..... مارو یا مر جاؤ.....''

ریفری نے تیزی سے سیٹیاں بجا کر ہمیں اپنی اپنی جگہ پر واپس جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے موٹے بھٹی کو آنکھ مار کر گول پوسٹ میں ڈٹے رہنے کا اشارہ کیا اور کھیل ایک بار پھر سے شروع ہو گیا۔ لیکن اس بار صورتِ حال مختلف تھی۔ اب لیاقت ہاؤس کے کھلاڑی اڑتے ہوئے گراؤنڈ سے باہر جاتے دکھائی دے رہے تھے، کچھ ہی دیر میں ان کا کپتان میرے پاس بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا نام بابر تھا اور ایک زمانے میں وہ بھی ان 23 تیئس کیڈٹس

میں شامل تھا جو "ڈاکٹر نو پرچی کیس" میں ہمارے ساتھ تین ہفتے تک رگڑا کھاتے رہے تھے۔ اس نے آتے ہی مجھے سرگوشی میں کہا۔

"ہے آدمی..... کیا ہماری ساری ٹیم کو آج کی ڈاکٹر نو کے ہسپتال پہنچانے کا ارادہ کر کے آئے ہو..... اب بس کر دو یار....."

"ٹھیک ہے..... اپنی ٹیم سے بھی کہہ دو کہ کِک فٹ بال کو ماریں..... میرے کھلاڑیوں کو نہیں۔"

بابر مسکرایا "اوکے..... سیز فائر....."

"رائٹ..... سیز فائر....." میں نے بھی انگوٹھا اٹھا کر اشارہ کر دیا۔ اگلے ہاف میں صاف کھیل ہوا اور بات پنالٹی کِکس تک پہنچ گئی۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا گول کیپر بھٹی سب سے آگے تھا۔ اس نے پانچ میں سے تین پنالٹی کِکس روک لیں اور دوسری جانب میری، فیصل، اسفر اور نثار روندو کی پنالٹی سیدھی ان کے گول میں گئی۔ ہم نے ایک گول کے مارجن سے فائنل جیت لیا تھا اور قاسم ہاؤس کی پچھلے دس سال میں یہ پہلی فٹ بال فائنل کی ٹرافی تھی جو آج ہم اپنے ہاتھوں میں اٹھائے پورے گراؤنڈ کا چکر لگا رہے تھے۔

صرف فٹ بال ہی نہیں بلکہ ہم جب سے بارہویں جماعت میں آئے تھے ہم نے رائیڈنگ، سوئمنگ، بیس بال، باسکٹ بال، جیولن تھرو اور نہ جانے کون کون سی ٹرافی سے فہد صاحب کا آفس بھر دیا تھا۔ ہمارے ہاؤس ماسٹر فہد صاحب کو ہمیشہ ہم سے شکایت رہی تھی کہ ہمارا بیچ ان کے ہاؤس میں آنے والا سب سے زیادہ شرارتی اور نظم وضبط توڑنے والا بیچ (Badge) تھا لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم نے نظم وضبط میں اور ڈسپلن میں نہ سہی، لیکن دیگر ہر شعبے میں وہ کارکردگی دکھائی کہ جو پچھلے کئی سالوں میں ہمارے سینئر نہیں دکھا سکے تھے۔ اب ہم ساتویں جماعت کے لاغر اور کم زور بدن والے ڈرے سہمے کیڈٹس نہیں تھے بلکہ اونچے، لمبے اور مضبوط جسموں والے کیڈٹ آفیسرز تھے۔ جن کے بدن ایکسٹرا ڈرل کی مشقتوں اور مہینوں تک بوجھ اٹھا اٹھا کر بھاگنے کی وجہ سے پک کر فولاد بن چکے تھے۔ گیارہویں جماعت تک ہم سزائیں کھا کھا کر اس حد تک ماہر ہو چکے تھے کہ اب پیٹی آفیسرز (پی۔اوز) کو ہمیں سزا دیتے دیتے پسینہ آ جاتا تھا۔

کئی مرتبہ ہماری شکایت کمانڈر صاحب تک بھی پہنچی لیکن ان کا ایسے معاملوں میں ایک بہت سیدھا اور واضح اصول تھا کہ چاہے شرارت کیسی بھی کیوں نہ ہو، وہ صرف ہماری پڑھائی کے رزلٹ اور کلاس ٹیسٹ کے نتیجے کو سامنے رکھ کر کسی بھی سزا کا فیصلہ کرتے تھے۔ ویسے بھی فوجی تربیت کے معاملات انہوں نے ایجوکیٹ کے حوالے کر رکھے تھے۔ انہیں صرف ہماری پڑھائی سے غرض ہوتی تھی اور ہماری پوری ڈارمیٹری میں سے صرف ایک بار موٹا بھٹی دسویں کے مڈٹرم ٹیسٹ میں بیماری کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری پوری کلاس کا رزلٹ ہمیشہ بہترین آتا تھا، لہٰذا کمانڈر صاحب کو کبھی ہمارے خلاف حتمی فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ البتہ پرنسپل صاحب کالج سے باہر بنک کے شدید مخالف تھے اور ایسی غلطی وہ کبھی معاف نہیں کرتے تھے لہٰذا اب تک یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم کبھی جانو کے شیرٹن ہوٹل سے رنگے ہاتھ نہیں پکڑے گئے تھے، حالانکہ سی۔پی۔او کو پکا یقین تھا کہ ہم ہفتے میں ایک آدھ بار دعوت اڑانے کے لیے کیمپس سے بنک Bunk ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے درجنوں چھاپوں کے باوجود ہم کبھی اس کے ہتھے نہیں چڑھے اور کئی بار تو بال بال بچے۔

(گیارہویں) فرسٹ ائیر کے دوران زندگی اپنے معمول پر ہی رہی تھی اور سوائے شیرل کی شادی کے، دیگر کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا۔ شیرل، ہیری کے ساتھ بیاہ کر پیا دیس سدھار گئی۔ مجھے شیرل کے خاندان کی طرف سے شادی میں شرکت کی خاص دعوت تھی اور میں چرچ میں سوٹ

میں ملبوس ہیری کو دیکھ کر حیران ہی تو رہ گیا تھا۔ اس لڑکے کو تو میں نے کئی مرتبہ ٹیوشن کے دوران آتے جاتے چرچ کے احاطے کے پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ کئی مرتبہ وہ گیٹ پر آ کر کسی دوسری نن (سسٹر) کے ذریعے ہیلن کو پیغام بھی بھجوایا کرتا تھا لیکن ہیلن اس سے ملنے نہیں جاتی تھی، کبھی کبھی جب میں ہاؤس ماسٹر سے نظر بچا کر اتوار کے روز چرچ سروس میں ہیلن سے ملنے جایا کرتا تو تب بھی یہی لڑکا ہمیشہ مجھے پیانو کے قریب سب سے پہلی رو میں بیٹھا نظر آتا تھا اور جب کبھی ہیلن کوائر سروس، Quire Service کے دوران پیانو بجاتی تو وہ نہایت انہماک سے ہیلن کو دیکھا کرتا تھا۔ شیرل ہمیشہ اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی اور کئی مرتبہ وہ دونوں ساتھ ہی واپس اپنے گھروں کو لوٹا کرتے تھے لیکن جاتے جاتے بھی ہیری کی نظریں ہیلن ہی کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ اسی لئے جب میں نے اسے چرچ کے ڈائس پر سفید دُلہنوں والے لباس میں ملبوس شیرل کے ساتھ کھڑے اور شیرل کو انگوٹھی پہناتے دیکھا تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ ہیلن نے میری آنکھوں میں جھانکتے سوال کو محسوس کر لیا اور نظروں ہی نظروں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

رات کو جوزف نے ہیری اور شیرل کے اعزاز میں ایک بہت شاندار پارٹی کا اہتمام بھی کیا ہوا تھا۔ خوب ہلّہ گلا ہوا اور سب ہی نے جوزف کے بجائے ہوئے وائلن اور پھر اکارڈین کی دُھن پر خوب رقص کیا۔ ایک ایسے ہی موقعے پر جب سب ہی شور شرابے اور کھانے پینے میں مشغول تھے، میں ہیلن کو ہال میں موجود نہ پا کر خود بھی اسے ڈھونڈنے کے لیے باہر باغیچے کی جانب چلا آیا جہاں ہیلن سنگترے کے پیڑوں کے پاس بچھے جھولے کے قریب خاموش سی کھڑی آسمان کو تک رہی تھی۔ شاید وہ بھی ان ستاروں کے جھرمٹ میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈ رہی ہوگی۔ میری آہٹ پا کر وہ چونک کر مُڑی اور مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"کوئی سوال مت کرنا آدی..... میرے پاس تمہارے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ہے....."

میں چپ ہی رہا اور ہیلن کے قریب ہی جھولے پر بیٹھ گیا اور میں نے ہیلن کو آسمان پر اپنا ستارہ دکھایا، سب سے واضح اور چمکدار..... اور ہیلن سے اس کے ستارے کے بارے میں پوچھا۔ ہیلن کچھ دیر آسمان کو دیکھتی رہی اور پھر اُس نے دُکھ بھرے لہجے میں بتایا کہ اس کا ستارہ کہیں کھو گیا ہے۔ اب ڈھونڈے سے بھی نہیں مل پا رہا۔ اس رات ہم دونوں چپ چاپ آسمان کو دیکھتے رہے۔ شیرل بیاہ کر ہیری کے ساتھ کینیڈا چلی گئی اور پھر بہت دنوں بعد ایک دن ہیلن نے اپنے لب کھول ہی دیے.....

ہیری بہت عرصے سے ہیلن کو چاہتا تھا۔ لیکن ہیلن نے اپنے لیے خدائی راہ اور مذہب کا راستہ اُس کی چاہت سے پہلے ہی منتخب کر لیا تھا۔ ہیری نے بہت پاپڑ بیلے اور بہت سر پٹخے لیکن ہیلن کے دل کا پتھر پگھلنا تھا نہ پگھلا۔ ہاں البتہ شیرل ہر اتوار چرچ سروس کے بعد ہیری کے ساتھ گھر آتے جاتے اس کی باتوں میں اس قدر کھوئی کہ کچھ ہی ہفتوں میں اُسے چاروں طرف صرف ہیری ہی ہیری دکھائی دینے لگا۔ اور حسبِ معمول اس نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے یہ راز اپنی سب سے بڑی رازداں ہیلن کو ہی بتایا۔ ہیلن نے نہایت سکون سے اپنی ہم نفس اور پیاری بہن کی بات سنی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے وعدہ کیا کہ ہیری اگر دنیا میں کسی کا ہوگا تو صرف شیرل ہی کا ہوگا۔ یہی وہ دن تھا، جب ہیلن نے پہلی مرتبہ ہیری کو شام کے وقت چرچ کے احاطے کے باہر گھومتے ہوئے خود گیٹ پر بلایا۔ پہلے تو ہیری کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ قسمت آج خود اس پر اتنی مہربان ہے، لیکن جب ہیلن نے اُس سے یہ سوال کیا کہ اگر وہ ہیری سے یہ پوچھے کہ وہ اس کے لیے اپنی کسی قیمتی چیز کی قربانی دے سکتا ہے تو ہیری کا

جواب کیا ہوگا؟

ہیری نے جواباً کہا کہ اس کی ملکیت میں اس کی سانسوں سمیت جو کچھ بھی ہے وہ ہیلن ہی کا تو ہے، لہٰذا یہ سوال ہی قطعی بے معنی ہے۔ لیکن ہیلن نے اس سے پھر کہا کہ جواب دینے سے پہلے وہ ایک بار پھر اچھی طرح سے سوچ لے کہ بعض دعوے صرف دعوے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ہیری نے پھر یہی کہا کہ آزمائش شرط ہے۔ تب ہیلن نے اسے شیرل کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے تھام لینے کی استدعا کی تو کچھ دیر تک تو ہیری کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا۔ ہیلن نے اسے خاموش دیکھ کر کہا کہ اگر ہیری چاہے تو وہ اپنا سوال واپس لے سکتی ہے کیونکہ یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ لیکن ہاں کرنے کی صورت میں ہیری کو ساری عمر کے لیے شیرل کو خوشیاں دینے کا وعدہ بھی نبھانا پڑے گا البتہ "نہ" کرنے کی صورت میں ہیلن اور ہیری کو وہاں سے اٹھنے کے بعد اس ملاقات کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہوگا۔

ہیری کے لیے شاید یہ زندگی کا سب سے بڑا امتحان تھا لیکن وہ بھی اپنے لفظوں کا پکا نکلا۔ اس وقت تو وہ چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا لیکن اگلے ہی ہفتے شیرل اپنے چہرے پر قوس وقزح کے سارے رنگ لیے بھاگتی ہوئی چرچ کے احاطے میں داخل ہوئی اور آتے ہی ہیلن سے لپٹ گئی۔ ہیری کے گھر والے اسی شام اس کا ہاتھ مانگنے آرہے تھے۔ شیرل جانتی تھی کہ اس معجزے کے پیچھے ہیلن ہی کا ہاتھ ہوگا لیکن وہ یہ کبھی نہیں جان پائی کہ ہیری نے ہیلن کی محبت کے سنگھاسن پر شیرل کی مورت خود ہیلن ہی کے کہنے پر سجائی تھی۔

میں ہیلن کی زبانی یہ ساری کہانی سن کر بہت حیران تھا۔ یہ محبت آخر کس بلا کا نام تھا۔ یہ انسان سے کیا کچھ کروا لیتی ہے۔

شیرل چلی گئی۔ ہم گیارہویں سے بارہویں جماعت میں آگئے۔ اب ہم سینئر کیڈٹ آفیسر بن چکے تھے اور اکیڈمی میں یہ ہمارا آخری سال تھا۔

راجہ کے خط اب بھی باقاعدگی سے مجھے آتے تھے لیکن میرا دل ڈوآپی کی رخصتی کے بعد کبھی محلے میں نہیں لگ پایا۔ بات صرف ڈوآپی کی رخصتی تک ہی رہتی تو شاید مجھے دھیرے دھیرے صبر آ ہی جاتا۔ لیکن ایسے لگتا تھا جیسے تقدیر کو ابھی ڈوآپی اور ان کے خاندان کے مزید کچھ امتحان لینا مقصود تھے۔ ڈوآپی کی رخصتی کو ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ صبح سویرے ایک نئی اُفتاد ان کے گھر کے آنگن میں ڈیرہ ڈال چکی تھی۔

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

دھوکہ

ڈوآپی کی رُخصتی کو آج تیسرا دن تھا اور تیسرے دن تو ویسے بھی دُلہن کو ولیمے کے بعد رات کو گھر چھوڑنے کے لیے ظفر کو خود آنا تھا لیکن وہ صبح سویرے ہی ڈوکو ان کے گھر چھوڑ کر باہر سے ہی واپس لوٹ گیا۔ لڑکی کو یوں اکیلا گھر کے صحن میں کھڑے دیکھ کر ماں باپ کے تو حواس ہی گم ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں عقدہ یہ کھلا کہ ظفر میاں نے ولیمے کا سارا بندوبست تو کر رکھا تھا اور اُنہیں اب صرف اپنی ایک بڑی رقم کی وصولی کا انتظار تھا جو ایک سودے کے سلسلے میں اُنہیں آج ہی ہونی تھی، لیکن ''اتفاق'' سے آج پارٹی نے کچھ ایسی مجبوری اور عذر پیش کر دیا تھا کہ خود ظفر بھی ان کے سامنے لاجواب ہو گیا تھا۔ لیکن بہر حال ولیمہ تو کرنا تھا۔ ظفر کے تمام دوست، برادری اور خود ڈو کے تمام خاندان کو دعوت نامے بھیجے جا چکے تھے۔ اب ایسے وقت میں ولیمہ منسوخ بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا، لہٰذا ظفر نے ڈوآپی کو غیاث چچا کے پاس جانے کا کہا تا کہ وہ غیاث چچا سے ولیمے کی رقم ''ادھار'' دلوا سکے۔ ظفر نے ڈوآپی سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی اسے سودے کی رقم ملی وہ غیاث چچا کے پیسے لوٹا دے گا۔ ڈوآپی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ جا کر اپنے ابا کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ڈوآپی جیسی خوددار لڑکی کے لیے یہ سب کچھ کس قدر مشکل ثابت ہوا ہوگا، اس کا اندازہ میں خوب لگا سکتا تھا۔

غیاث چچا نے بنا کوئی دوسرا سوال کیے رقم ڈوآپی کے ہاتھ پر رکھ دی اور فضلو بابا سے کہہ کر تانگہ منگوایا اور ڈوآپی کو فضلو بابا کے ساتھ ان کے گھر واپس بھجوا دیا۔ یوں ڈوآپی کا ولیمہ تو خوب شان و شوکت سے ہو گیا لیکن غیاث چچا کا ماتھا اُسی دن ٹھنک گیا کہ شاید اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے میں ان سے کہیں کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔ ظفر کے چہرے پر ولیمے والی رات بھی کسی قسم کے خجالت کے کوئی آثار نہ تھے جیسے اُسے اس بات کی ذرہ برابر بھی شرمندگی نہ ہوئی ہو کہ اس کے ولیمے کی دعوت کا خرچ بھی اُس کے سُسرال کو ہی اٹھانا پڑا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا قہقہے لگاتا رہا اور ولیمے کے شاندار ''انتظام'' پر سب کی مبارکباد اور داد وصول کرتا رہا۔ رات گئے جب دعوت ختم ہوئی تو اُس نے خود اپنے دوستوں کے ساتھ رُکنے کا عذر کر کے ڈو کو وہیں سے ان کے ماں باپ کے ساتھ مکلاوے پر تین دن کے لیے گھر بھیج دیا۔

اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہی ہو گیا۔ ظفر میاں کی اتفاقاً پڑنے والی مجبوریوں کی فہرست لمبی ہی ہوتی گئی، اور غیاث چچا سے ہر بار قرض کے نام پر بٹوری گئی رقم کبھی واپس نہ ملی۔ بلکہ کچھ عرصے بعد تو ظفر نے یہ قرض نام کی دُم لگانے کا تکلف ہی ختم کر دیا اور اب تو وہ اپنے حق کے طور پر ڈوآپی کے ذریعے یا پھر خود ہی باتوں باتوں میں رقم مانگ لیا کرتا تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ ڈو اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ آخر ان کے پاس جو کچھ بھی ہے، ان کی بیٹی کا ہی تو ہے بھلا وہ یہ سب اپنے ساتھ تو لے کر نہیں جائیں گے نا.....؟

غیاث چچا ایک وضع دار شخص تھے اور چپ چاپ اپنے غلط فیصلے کی قیمت چکاتے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ظفر کے کاروبار کی اصلیت بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ گاڑیوں کا وہ شوروم اس کی ملکیت نہیں تھا بلکہ اس کا ایک دوست جو سال ڈیڑھ کے لیے اپنی قسمت آزمانے دوبئی گیا ہوا تھا، وہ اس شوروم کا مالک تھا۔ اس کی قسمت دوبئی میں نہیں کھلی اور وہ جلد ہی یہاں باقی سب کی قسمت پھوڑنے کے لیے واپس آن موجود ہوا۔ ظفر اس کے شوروم پر صرف ایک ڈیلر کا کام کرتا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں وہ شوروم کا انتظام سنبھالتا تھا۔ انتظام سنبھالتے سنبھالتے ظفر میاں نے یہاں بھی اپنے ہاتھ دکھا ہی دیئے تھے لہٰذا دوست نے آ کر جب حساب کتاب کیا تو تقریباً پچاس ہزار روپے کا گھپلا نکلا۔ ظفر کی ملازمت تو جانی ہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیاث چچا نے اچھے وقتوں میں زمین کا ایک ٹکڑا جو اپنے بڑھاپے کے لیے لے کر سنبھال رکھا تھا وہ بھی بک گیا کیونکہ اب غیاث چچا کے پاس ظفر کو دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

اب ظفر بے روزگار تھا لیکن ٹھاٹ اس کے اب بھی وہی شاہانہ تھے۔ محنت کر کے روزی کمانا اس نے کبھی سیکھا نہیں تھا اور اُسے ہمیشہ سے شارٹ کٹ استعمال کر کے ایک ہی رات میں لکھ پتی بننے کا جنون تھا۔ اسی ذہن کے خناس کی وجہ سے وہ مختلف جگہوں پر قسمت آزماتا رہتا تھا اور جو کچھ کماتا اس سے زیادہ لُٹا دیتا تھا۔ مثلاً کبھی پرائز بانڈ کی پرچیوں کے نمبر کا دھندہ شروع کیا تو کبھی مختلف لاٹریوں کے ٹکٹ اس کے گھر میں بکھرے نظر آتے۔ کبھی خلیج کے ممالک کے بروکرز سے مل کر ویزے کا کام شروع کیا تو کبھی جیولرز کے ساتھ مل کر سونے کے بھاؤ لگاتا نظر آتا۔ غرض دنیا کا ایسا کوئی مختصر راستہ باقی نہیں بچا تھا، جو ظفر نے جلد دولت حاصل کرنے کے لیے نہ آزمایا ہو۔ لیکن ظاہر ہے، ایسے طریقوں سے اگر کوئی دولت مند بن سکتا تو دنیا اس وقت اُس جیسے کنگلوں سے خالی ہوتی۔ اس بے روزگاری نے اُسے مزید چڑچڑا کر دیا تھا اور اب وہ باقاعدہ ڈوآپی پر چلانے بھی لگا تھا۔ ڈوآپی ناز و نعم کی پلی ہوئی ایک ایسی لڑکی تھیں، جن کی پرورش میں تہذیب اور ادب و آداب کا لحاظ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ظفر کے اس رویے سے سہم جاتیں اور چپ کر کے گھر کے کسی کونے میں سکڑی سمٹی سی بیٹھی رہتیں۔ لیکن ظفر کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلتی اور تیسرے دن پھر وہ غیاث چچا کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی ہوتیں۔ گیارہویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد میں جب چند دن کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ان دنوں انہیں وہاں آتے جاتے اکثر دیکھتا رہتا۔ اب ہم بڑے ہو چکے تھے لہٰذا اب ہمارا اُس بے تکلفی سے سبھی کے گھروں میں گھس جانا، خود ہمیں ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس دن ہم سب محلے کے بڑے میدان میں وکٹیں گاڑے کرکٹ کھیل رہے تھے، میں بیٹنگ کر رہا تھا جب میں نے ڈوآپی کو فضلو بابا سمیت تانگے پر سوار محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ڈوآپی تانگے سے اتریں تو نہ جانے کیوں مجھے بہت کم زور دکھائی دیں۔ میں نے دُور ہی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا تو وہ ہلکے سے مُسکرا دیں۔ وہی گلابی مسکراہٹ، جس کا میں بچپن سے ہی دیوانہ تھا۔

ان کے گھر میں جاتے ہی راجہ نے، جو وکٹ کیپنگ کر رہا تھا، ظفر کو ایک موٹی سی گالی دی اور مجھ سے کہا کہ ضرور اُس ظفر نے کوئی نیا مطالبہ دے کر انہیں گھر بھیجا ہوگا۔ ڈوآپی کی ساری کہانی اب کوئی راز نہیں رہ گئی تھی، کیونکہ ایک آدھ بار جب غیاث چچا وقت پر ظفر کو پیسے نہیں ادا کر پائے تھے تو اس نے ان کے دروازے پر آ کر انہیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ اور بہت سی اُلٹی سیدھی باتیں اس زوردار آواز میں کی تھیں کہ پورے محلے کو پتہ چل گیا کہ غیاث چچا جیسا شریف انسان کس غلط انسان کے چنگل میں پھنس چکا ہے۔

کچھ ہی دیر میں فضلو بابا اندر سے لاٹھی ٹیکتے نکلے اور مجھے آ کر کہا کہ ''وجیہہ بی کہتی ہیں کہ آدی شام کی چائے ہمارے ہاں پئیں گے۔''.....

یہ فضلو بابا کا مخصوص انداز تھا، وہ وجیہہ بی کی بات کو باقاعدہ حکم کی طرح آ کر سُنا جاتے اور جواب کا انتظار کیے بنا ہی پلٹ بھی جاتے۔ نھوان کی بہت اچھی نقالی کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر فضلو بابا ہوتے تو وہ لاٹھی لے کر نھو کے پیچھے بھاگتے اور ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

میں ڈوآپی کے گھر میں داخل ہوا تو وہ صحن میں ہی چائے کی میز سجائے بیٹھی تھیں، ہاتھ میں کوئی کتاب تھی جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھیں۔ میرے دل میں درد کی ایک ہوک سی اٹھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ تقدیر نے اس میر کی غزل اور خیام کی رُباعی جیسی گل اندام لڑکی کو یہ کس جاہل جلاد کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔ اُسے تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ درد اور غالب شاعر تھے یا کسی لاٹری کمپنی کے ٹکٹ فروخت کرنے والے بروکر۔ پتہ نہیں ظفر نے ڈوآپی کی نثر اور شاعری کی کتابیں بھی باقی رہنے دی تھیں یا پھر انہیں بھی بیچ کر کھا گیا تھا؟

ڈوآپی نے مجھے دروازے میں کھڑے دیکھا تو آواز دی۔

''اندر آ جاؤ آدی..... وہاں کیوں کھڑے ہو.....؟''

میں کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور ان کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا انہوں نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے اتنے دن سے..... ڈوآپی کی یاد نہیں آتی اب کیا.....؟''

''نہیں..... ایسی بات نہیں ہے..... آپ سے تو بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، پر..... کچھ جھجک سی ہوتی ہے۔''

وہ حیرت سے نظریں اٹھا کر بولیں۔

''جھجک..... کیسی جھجک.....؟''

''وہ..... میں اب بڑا ہو گیا ہوں نا..... اس لیے.....''

میرا جواب سُن کر ڈوآپی زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''اوہ..... تو یہ بات ہے..... ہمارا آدی اب بڑا ہو گیا ہے..... واقعی بھئی..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا..... اماں..... اماں بات سنیں نا..... آدی کیا کہہ رہا ہے۔''

انہوں نے آوازیں دے کر سکینہ خالہ کو بھی باورچی خانے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور ہنستے ہنستے انہیں بھی میری کہی ہوئی بات بتائی۔ سکینہ خالہ بھی زور سے ہنس پڑیں۔ میں دم بہ خود انہیں ہنستے ہوئے دیکھتا رہا..... کتنے دنوں کے بعد اس گھر میں ڈوآپی کی ہنسی کی آواز گونجی تھی۔ مجھے انہیں ہنستے دیکھ کر بہت ہی اچھا لگا اور میں نے اُسی لمحے اپنے دل میں خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ یا میرے مولا! اس معصوم لڑکی کے ہونٹوں پہ یہ ہنسی سدا کے لیے دان کر دے۔

اس شام انہوں نے بہت دیر تک مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ کیڈٹ کالج کے بارے میں بھی پوچھتی رہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگلا سال ہمارا اکیڈمی کا آخری سال ہو گا اور میری بہت خواہش ہے کہ کاش وہ بھی میری پاسنگ آؤٹ پریڈ دیکھنے کے لیے میرے کالج آئیں۔ اس دن میں

نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں صرف انہی کے کہنے پر واپس کیڈٹ کالج گیا تھا لہٰذا میری پاسنگ آؤٹ سلامی پریڈ کی اصل حق دار بھی وہی ہوں گی۔

یہ سُن کر ان کے ملیح چہرے پر اُداسی کا ایک ہلکا سا بادل چھایا پھر وہ جلدی سے مسکرا کر بولیں کہ وہ پوری کوشش کریں گی کہ کسی طرح وہاں آ سکیں۔ لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ ان کا میری پاسنگ آؤٹ پر اتنی دُور آنا ناممکن ہے۔ لیکن وہ ڈھو آپی ہی کیا جو کسی کا دل توڑ دیں.....؟ یہ ہُنر تو انہوں نے ساری زندگی سیکھا ہی نہ تھا۔ سو اُس لمحے میرے دل کو بھی انہوں نے اُسی خوبصورتی سے بہلا دیا۔

میری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں کالج چلا آیا۔ لیکن ڈھو آپی کی اس شام کی باتیں اور بارہویں جماعت کے بارے میں کی ہوئی نصیحتیں بھی میرے سنگ سنگ تھیں۔ جب کبھی میں ذرا سی دیر کے لیے بھی تھکن دُور کرنے کے لیے آنکھیں موندھ لیتا تب وہی گلابی شام کی ملاقات میرے ذہن کے کسی گوشے سے چھم سے میری آنکھوں میں اتر آتی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آخری بنک "Bunk"

فہد صاحب کو شک ہو گیا تھا کہ ہم رات کو کہیں نہ کہیں غائب ضرور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ہاسٹل کے بیرونی جنگلے کے تالے بدل دیئے تھے۔ ہم ویسے بھی اوپر والی منزل پر تھے اور اس کی راہداری کے آخری جنگلے کی ہم نے جمعہ بیرے کی مدد سے چابیوں کی نقل بنوا رکھی تھی۔ لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ جنگلہ ہی ختم کر کے وہاں مستقل دروازہ لگا کر گارڈ بٹھا دیا گیا ہے۔ اب ہمارے پاس واحد راستہ چھت سے نیچے اُترتے ہوئے پانی کے پائپ تھے، جن سے لٹک کر ہم رات کو نائٹ فالن کے بعد نیچے اتر آتے اور جلو کے شیرٹن ہوٹل سے کبھی کھانا، کبھی چائے اور کبھی کبھار لسی کے گلاس غٹاغٹ چڑھا کر واپس انہی پائپوں کے ذریعے چھت تک پہنچ جاتے اور چھت کی سیڑھیوں سے اندر دوسری منزل کی راہداری تک پہنچ کر سو جاتے۔

ہمارے سالانہ امتحانات قریب آ رہے تھے اور ہم آج کل رات کو بہت دیر تک پڑھتے تھے کیونکہ بارہویں جماعت کے لیے لائٹ آف کی پابندی ان کے امتحانات کے قریب ختم کر دی جاتی تھی۔ ایسے میں موٹے بھٹی کو رات بارہ بجے کے بعد بھوک کا ایک آدھ دورہ ضرور پڑتا تھا، اور وہ ہماری جان کے درپے ہو جاتا کہ کچھ کھانے کے لیے چلا جائے۔

اس رات بھی میں اسفر اور فیصل کیمسٹری کے فارمولے رٹ کر ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے کہ اچانک بھٹی کے پیٹ کی بھٹی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی اور وہ ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا کہ اُسے فوراً مرغ چھولے کھانے کو چاہئیں۔ کچھ دیر تو ہم اس کی بک بک نظر انداز کرتے رہے پھر اسفر نے تنگ آ کر کتاب پٹخ دی۔

"یار پہلے اس موٹے کا کچھ کرو..... اس کی باتیں سن سن کر تو مجھے بھی بھوک لگنے لگ گئی ہے۔"

ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ اصل میں ہم سب کا دل بنک کے لیے مچل رہا ہوتا تھا لیکن ہم سب بھٹی کے بولنے کا انتظار کرتے رہے تاکہ کسی مصیبت کی صورت میں ہمیں الزام دینے کے لیے کسی کا کندھا دستیاب ہو۔

ہم نے مجید چھوٹو سے بھی پوچھا کہ کیا ارادہ ہے۔ وہ پہلے ہی سے چھت پر بیٹھا چاند کی روشنی میں ریاضی کے تھیورم اپنی موٹی کھوپڑی میں گھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے فوراً کتاب دُور پھینک دی کہ جب تک اس کے پیٹ میں کچھ نہیں جائے گا، وہ کچھ بھی رٹ نہیں پائے گا۔

ہمارا اصول یہ تھا کہ ہم ایک ایک کر کے چھت سے نیچے اترتے تھے۔ سب سے پہلا لڑکا اترنے کے بعد کچھ دیر آس پاس کا جائزہ لیتا اور پھر ہلکی سی سیٹی بجا کر اشارہ کرتا تب دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا اور چوتھا لڑکا پائپ سے لٹکتے ہوئے نیچے اتر جاتا۔ سب سے پہلے مجید چھوٹو نے

آستینیں اوپر کیں اور چھت کی منڈیر پر پاؤں نیچے لٹکا کر پائپ ہاتھوں سے تھام لیا اور نیچے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم کافی دیر تک اُس کے سگنل کا انتظار کرتے رہے لیکن نیچے سے سوائے ایک 'دھپ' کی آواز جو شاید مجید چھوٹو کے کودنے کی آواز تھی، دوسری کوئی آواز نہیں آئی۔ آصف بھٹی جس کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا اس نے مجید کو کئی صلواتیں سناتے ہوئے کہا کہ وہ پھر سیٹی بجانا بھول گیا ہو گا لہٰذا بھٹی نے پائپ تھاما اور وہ بھی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم نے پھر چند ہی لمحوں میں بھٹی کے اترنے کی آواز تو سنی لیکن اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ اب میں، فیصل اور اسفر چھت پر رہ گئے تھے۔ ہم شدید اُلجھن میں تھے کیونکہ اگر نیچے کسی پٹی آفیسر وغیرہ نے انہیں بھاگتے ہوئے پکڑ بھی لیا ہوتا تو شور شرابہ تو ہوتا۔ یہ دونوں تو نیچے جا کر بالکل ہی چپ ہو گئے تھے۔ اب فیصل کو غصہ آیا اور اس نے کہا کہ ضرور یہ دونوں کسی شرارت کے چکر میں ہیں۔ لہٰذا وہ خود جا کر دیکھتا ہے۔ فیصل اترا اور پھر وہی خاموشی..... میں اور اسفر اوپر چند لمحے انتظار کرتے رہے اور پھر میں نے اسفر سے کہا کہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ میں نیچے جا رہا ہوں لیکن اگر اگلے پانچ منٹ تک میری سیٹی کی آواز اُسے سنائی نہ دے تو وہ نیچے نہ اُترے بلکہ وہیں چھت پر ہمارا انتظار کرے یا پھر نیچے ڈارمیٹری میں جا کر ہمارے لیے ''گمک'' کا بندوبست کرے۔

میں نے دل ہی دل میں ان تینوں کو سخت سناتے ہوئے پائپ کو تھاما اور چھت کی منڈیر سے نیچے اتر کر پائپ سے لٹکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ ابھی تین چار فٹ ہی نیچے اترا ہوں گا کہ اچانک مجھے یوں لگا کہ جیسے میں خلا میں تیر رہا ہوں۔ پائپ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں کسی نرم اور لجلجی سی چیز پر آ کر گرا، زوردار دھپ کی آواز آئی اور کسی کی 'ہائے' کی آواز کے ساتھ ہی میرا ذہن ڈوب گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے اوپر کوئی بوری آ کر گری اور اس بار 'ہائے' کی آواز نکالنے کی باری میری تھی۔ کچھ دیر تک ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ میرے بازو میں، جو نیچے ٹکرایا تھا شدید درد ہو رہا تھا۔

پھر سب سے پہلے میرے حواس اس وقت یکجا ہوئے جب بھٹی نے زور سے 'ہائے مر گیا' کا فریادی نعرہ لگایا۔

ہم پانچوں نیچے زمین پر ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے تھے اور میرے اوپر گرنے والا بوجھ کسی بوری کا نہیں تھا بلکہ اس احمق اسفر کا تھا جو میری ہدایت کے باوجود چھت سے اترنے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ ہم نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ پائپ جس سے لٹک کر ہم نیچے اترتے تھے، چھت سے تین فٹ کی لمبائی تک نیچے آنے کے بعد یک دم ہی غائب ہو چکا تھا، لہٰذا خلاء میں تیرنے کا جو تجربہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم سب ہی کو ہوا تھا وہ اسی پائپ کے اچانک ختم ہو جانے کی وجہ سے تھا۔ ہم پانچوں دوسری منزل سے پائپ ختم ہونے کے بعد ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے سیدھے نیچے زمین پر ''دھپ دھپ'' گرتے رہے اور ہم سب میں سب سے زیادہ بُری حالت مجید چھوٹو کی تھی۔ جو سب سے پہلے چھت سے اُترا تھا۔ اُترا کیا تھا کسی ٹوٹے جہاز کی طرح رن وے پر گرا تھا۔ ہم نے بمشکل اِدھر اُدھر ہو کر اپنے نیچے سے مجید چھوٹو کو ڈھونڈ کر نکالا۔ وہ بالکل ہی بے سُدھ پڑا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ ہم سب نیچے گھدی ہوئی کیاریوں میں سے ایک کے اندر آ کر گرے تھے، ورنہ اگر زمین سخت ہوتی تو شاید ہماری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ لیکن اس وقت بھی ہم سب کی حالت انتہائی مخدوش تھی۔ مجید چھوٹو اور بھٹی تو باقاعدہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ جنہیں ہم بڑی مشکل سے گھسیٹ گھسیٹ کر کیاریوں کو پانی دینے والے فوارے سے منہ پر پانی چھڑک چھڑک کر ہوش میں لائے۔

ابھی ہم اپنے ہواس بحال بھی نہ کر پائے تھے کہ اچانک ہی چاند گاڑی کی روشنی براہ راست ہمارے اوپر آ کر پڑی۔ ہم میں اس وقت اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر بھاگ ہی جاتے یا کسی درخت یا جھاڑی کے پیچھے چھپ جاتے۔ کچھ ہی دیر میں بخشو سی۔ پی۔ او ہمارے سر پر ٹارچ تانے کھڑا حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا کہ یہ آدھی رات ہم پانچوں ان کیاریوں میں لیٹ کر کون سی باغبانی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ رات کو سبزے میں لیٹ کر پڑھنے سے سبق جلدی ذہن نشین ہوتا ہے لیکن اس نے ہماری ایک نہیں سنی اور ہمیں اٹھ کر اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہم اٹھ کر چل سکتے تو اب تک جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے جہاں سی۔ پی۔ او کے فرشتے بھی ہماری خبر نہ پا سکتے۔ سب سے پہلے اسفر نے اٹھ کر ''چلنے'' کی کوشش کی اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا کر دوسری کیاری میں زمین بوس ہو گیا۔ اب بخشو کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور کچھ ہی لمحوں بعد ہم سب کو چاند گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر نو کے ہسپتال کی جانب لیجایا جا رہا تھا۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ اگلے دن ہم پانچوں ہاتھوں اور پیروں پر پلاسٹر چڑھائے ہسپتال کے وارڈ میں ایک لائن سے بستروں پر ٹنگے ہوئے تھے۔ یہ پلاسٹر اگلے چار ہفتے کے لیے ہمارے جسموں پر منڈھا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ گزشتہ شام ہی مزدوروں نے فہد صاحب کے کہنے پر وہ پائپ کاٹ کر علیحدہ کر دیا تھا کیونکہ دوسری جانب نئے پائپ ڈال دیئے گئے تھے اور اب وہ پرانے پائپ متروک ہو چکے تھے۔ بہر حال یہ ہمارا آخری بنک ثابت ہوا کیونکہ چار ہفتے بعد جب وہ پلستر ہمارے جسموں سے اترا تو دو دن بعد ہمارے سالانہ امتحانات کے پرچے شروع ہونے کی تاریخ تھی اور سالانہ امتحان کے بعد ہماری آخری پاسنگ آؤٹ پریڈ ہونا تھی۔ اس رات کے زخموں کے نشان ایک میٹھی یاد بن کر ہمیشہ کے لیے ہمارے جسموں پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے، جو ہمیشہ ہم پانچوں کو اس آخری اور نامکمل بنک کی یاد دلاتے رہے۔

رشتوں کی سُولی

ذوجو آپی کے غموں کی داستان ظفر کی بے روزگاری سے شروع ہوئی تھی یا پھر یہ ان کے درد کی آخری حد تھی۔ اس کا فیصلہ کبھی کوئی نہیں کر پایا۔ تابوت میں آخری کیل اسی روز ٹھونک دی گئی تھی جب ظفر نے جوئے کی پہلی بازی دوستوں کے کہنے پر اس امید پر کھیلی کہ شاید جس دولت کے انبار کی کھوج وہ باہر بازار میں کر رہا تھا، وہ یہاں اس بند کمرے کے دھوئیں بھرے ماحول میں لگی اس بازی کے ذریعے اس کے قدموں میں اپنا ماتھا ٹیک دے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا "جواء..... کسی کا نہ ہوا....." تو پھر وہی جواء ظفر پر کیسے مہربان ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ جیب میں تھا وہ ہاتھ کی گھڑی اور سُسرال کی جانب سے پہنائی گئی انگوٹھی سمیت وہیں کمرے کی میز پر چھوڑ کر نکلنا پڑا، ساتھ ہی ساتھ گلے میں اچھے خاصے قرض کا طوق بھی پڑ چکا تھا۔

ظفر نے حسب معمول یہ سارا بوجھ گھر آ کر ذوآپی کے نازک کندھوں پر دے ڈالا اور پھر سے انہیں ایک لمبی رقم کی وصولی کے لیے غیاث چچا کے پاس جانے کے لیے کہا، لیکن ذوآپی جانتی تھیں کہ اب ان کے میکے کے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اپنا زیور اور چند قیمتی چیزیں جو وہ اپنے جہیز میں لائی تھیں، وہ سب کا سب پہلے ہی ظفر کے حوالے کر چکی تھیں۔ لہٰذا پہلی بار انہیں ظفر کو ناں کہنا پڑا اور یہی ناں ظفر کو آگ بگولہ کرنے کا باعث بن گئی۔ اس نازک سی چھٹانک بھر لڑکی کی یہ مجال کہ وہ اس کو ناں کہے۔ وحشی پن میں وہ رشتوں کا احترام بھی بھلا بیٹھا اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ذو کے چہرے پہ اپنا نشان چھوڑ گیا۔

راجہ کے خط مجھے اب بھی اُسی تسلسل سے آتے تھے۔ اور وہ آس پاس کی سنی سنائی اور اپنی آنکھوں دیکھی ہر اہم خبر کی تفصیل مجھے لکھ کر بھیجتا تھا۔ پھر ایک دن اس کے ایک خط نے میرے بہت سے پرانے زخم ادھیڑ کر رکھ دیے۔ راجہ نے لکھا تھا کہ بالآخر طاہر بھائی کے قتل کے پانچ سال بعد اکو کی پھانسی کی تاریخ مقرر ہو ہی گئی اور اس بار یہ حتمی تاریخ تھی۔ کیونکہ اس کی تمام اپیلیں مسترد ہو چکی تھیں۔ ہمارے سالانہ امتحانات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل یعنی بائیس (22) اپریل اس کی پھانسی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔

حالانکہ محلے کے ہر فرد نے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا لیکن کوئی ایک ہستی ایسی بھی تھی، جس کا چین اور سکون اس خبر نے لوٹ لیا تھا..... اور وہ بدنصیب تھی اکو کی ماں..... جب تک کیس چلتا رہا اور لوگ اس کے بیٹے کے ظلم کی داستانیں بیان کرتے رہے، وہ خود جھولی آسمان کی جانب اٹھا اٹھا کر اکو کو بددعائیں دیتی رہی، لیکن جب حکومت نے اس کی موت کی تاریخ مقرر کر دی تو ماں کا صبر و قرار اچانک ہی لٹ گیا۔ کچھ بھی ہو..... ماں آخر ماں ہی تو ہوتی ہے اُس نے جس اکو کو نو ماہ پیٹ میں اور پھر اپنے ہاتھوں کے پالنے میں جھولا جھلا کر بڑا کیا تھا، اسے سُولی پر لٹکتا کیسے دیکھ سکتی تھی.....؟

بالے نے راجے کو بتایا تھا کہ جس دن سے اس کی ماں کو اُگو کی پھانسی کا پتہ چلا تھا، اسی دن سے وہ راتوں کو اچانک ہی جاگ اٹھتی اور صحن کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ اس کے اندر کا اضطراب اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا اور کوئی اس سے بات کرے تو وہ یوں پھونک پڑتی تھی، جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ ہر گزرتا دن اُگو کی پھانسی کی تاریخ کو قریب لاتا جا رہا تھا اور اُگو کی ماں کے چہرے سے خون کا رنگ مٹتا جاتا اور وہ روز بروز پیلی پڑتی جاتی تھی۔

اور پھر آخر کار وہی ہوا جس کے لیے مائیں مشہور ہیں، اُگو کی ماں بھی اپنے دل سے ہار گئی اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بالے کے ابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ اس کے ساتھ طاہر بھائی کے اماں ابا کے گھر جا کر ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیں کہ ان کے بیٹے کے اس گناہِ عظیم کو بخش دیا جائے۔ اُگو کے باپ نے یکسر انکار کر دیا کہ آخر وہ کس منہ سے ایک مقتول بیٹے کے غم زدہ ماں باپ کے زخموں پر مزید نمک چھڑکنے جائے گا۔ ماں نے وہاں بات بنتی نہ دیکھی تو خود ہی اپنی بیٹی کو لیکر عزیزہ خالہ کے در پر جا کر بیٹھ گئی، اس روز سارا محلہ اس کی آہ و بکا سے لرزتا رہا، سبھی محلے داروں کو اُگو کی ماں سے ہمدردی بھی تھی لیکن اُگو کا جرم ہی ایسا تھا کہ اس ظلم کے آگے ہر ہمدردی ہیچ تھی۔

اُگو کی ماں نے اب اپنا یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ وہ صبح سویرے طاہر بھائی کے گھر کے باہر آ کر بیٹھ جاتی اور رات گئے تک چپ چاپ بنا کچھ کھائے پیئے وہاں پڑی رہتی اور گھر سے باہر آتے جاتے ہر شخص سے اُگو کو معافی دلوانے کی فریاد کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کی اپنی حالت بھی لمبے فاقوں کی وجہ سے بگڑنے لگ گئی تھی اور کئی مرتبہ وہ وہیں دروازے کے پاس بے ہوش پڑی ملتی۔ تب اُگو کے ابا یا کوئی اور ہمدرد اسے اٹھوا کر گھر بھجوا دیتے۔ لیکن دوسرے ہی روز وہ پھر اُسی در پر ماتھا ٹیکے ہوئی نظر آتی۔ اُس کی حالت ایسی تھی کہ طاہر بھائی کے ابا شکور چچا خود ایک روز اُس پر غصے سے برستے برستے رو پڑے کہ وہ کیوں روزانہ ان کے خاندان کے زخمی دلوں کو مزید گھائل کرنے کے لیے یہاں آ جاتی ہے۔ جب ایک بار اُس سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی صورت اُگو کو معاف نہیں کر سکتے اور اسے پھندے پر لٹکتا دیکھ کر ہی ان کے زخم کچھ مندمل ہو سکتے ہیں تو پھر روزانہ کی اس بحث سے کیا حاصل.....؟

لیکن یہاں مسئلہ صرف اُگو کی سولی کا نہ تھا۔ وہ تو سولی پہ لٹک کر ہمیشہ کے لیے نجات پا جاتا اور اگلے جہاں میں اپنے گناہوں کا حساب دیتا پھرتا لیکن اس کے پھندے پر لٹکنے کے بعد یہاں دنیا میں اس کے اپنوں کو مرتے دم تک جس سولی پر ٹنگا رہنا تھا اس کا حساب دینے والا کوئی نہ تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ اُگو کے ماں باپ کس قدر بھلے لوگ تھے اور سبھی کا دل ان کی اس اذیت سے کٹا جاتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی جس نے جرم کیا تھا وہ تو چند لمحے پھندے پر جھولنے کے بعد بری ہو جائے گا لیکن جو بے قصور ہیں وہ ساری عمر اُسی سولی پر جھولتے رہیں گے۔ یہ کیسا انصاف تھا؟؟

پھر سب سے پہلے یہ بات طاہر بھائی کے ابا کی سمجھ میں آ گئی کہ پھندہ صرف اُگو کے گلے میں نہیں، بلکہ نہ جانے اور کتنی جانوں کو لگے گا، اور شاید ان میں اُگو کے خاندان کو عمر بھر پھانسی پر لٹکتے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی لہٰذا ایک ڈھلتی شام جب اُگو کی ماں اپنی ویران آنکھیں لئے ان کے دروازے کے سامنے، مٹی میں خاک ہوئی پڑی تھی، انہوں نے گھر سے چادر لا کر اس پر ڈال دی اور اسے اٹھا کر اپنے گھر کے صحن میں لے آئے۔

عزیزہ خالہ نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور اپنے میاں کو دھمکی دے دی کہ اگر انہوں نے ان کے بیٹے کے قاتل کو معاف کرنے کے بارے میں سوچا بھی تو وہ ان کا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔ اُگو کی ماں عزیزہ خالہ کے کمرے کے دروازے سے سر پٹخ پٹخ کر

لہولہان ہوگئی لیکن وہ دروازہ اُس پر کبھی نہ کھلا۔

شکور چچا نے بالے کے ابا کو پیغام بھجوایا کہ انہوں نے اپنے خدا کے لیے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیا ہے لیکن وہ اُس کی ماں کے ہاتھوں مجبور ہیں، جس کا دل اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھنے کے بعد پتھر ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ اس دوسری ماں کو آ کر سنبھالیں جو اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے خود اپنا آپ گنوائے دے رہی ہے، اور وہ چاہ کر بھی اُس کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے کیونکہ اگر وہ دوسری ماں کا ساتھ دیتے ہیں تو اپنی آخری عمر کے سہارے یعنی اپنی شریکِ حیات کو ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے۔

بالے کے ابا بالے کے ساتھ آئے اور نیم بے ہوش سی اُگو کی ماں کو وہاں سے لے گئے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے ابا سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی کہ یہ بھی اُنہی کا ظرف ہے کہ اپنے بیٹے کے قاتل کی ماں کو انہوں نے اس قدر عزت دی۔ اگلی صبح اُگو کی پھانسی کی تاریخ مقرر تھی اور وہ رات بالے کے گھرانے پر کس قیامت کی طرح اتری تھی، شاید اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

اگلی صبح چار بجے جیل کے معمول کے مطابق، گاڑی طاہر بھائی کے دروازے پر ان کے اماں ابا کو بطور وارث پھانسی گھاٹ پر پھانسی کی شہادت کے لیے لینے آ چکی تھی۔ خالہ عزیزہ اور شکور چچا چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ کر جیل کی جانب روانہ ہو گئے جیل کے باہر اندھیرے میں انہیں اُگو کے ماں باپ بھی کھڑے نظر آئے جو اپنے بیٹے کی لاش وصول کرنے کے لیے وہاں خود لاش بنے کھڑے تھے۔ اُگو کی ماں کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور اب وہ خالی آنکھوں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ جیلر شکور چچا اور خالہ کو لے کر پھانسی گھاٹ پہنچ گیا تھا اور ڈاکٹر، مجسٹریٹ اور جلاد بھی اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں اُگو کو کمر پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ دو محافظ لے آئے۔ اُگو کے پیروں میں جان بالکل بھی نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنے محافظوں کے کاندھوں پر بوجھ ڈالے تقریباً لٹکتا ہوا پھانسی گھاٹ تک لایا گیا تھا۔ اس کا سڈول جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور آنکھوں کی روشنی بجھ چکی تھی۔

شکور چچا اور خالہ عزیزہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جلاد کو اُگو کے چہرے پر سیاہ کپڑا اڈھا نپتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھانسی کا پھندہ اس کے گلے میں ڈال کر جلاد لکڑی کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے اپنی جگہ پر جا پہنچا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر ان کی گھڑی پر تھی تا کہ وہ ایک سیکنڈ کی بھی جلدی یا تاخیر کیے بنا جلاد کو لیور کھینچنے کا اشارہ کریں۔

جیلر نے آخری مرتبہ عزیزہ خالہ اور شکور چچا کی طرف دیکھ کر تصدیق چاہی اور دونوں کی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے مجسٹریٹ سے اجازت کی درخواست کی۔ مجسٹریٹ نے وقت پورا ہوتے ہی جلاد کو اشارہ کیا اور جلاد نے لیور کھینچنے کے لیے اپنی طاقت مجتمع کر کے لیور پکڑ لیا۔ مجسٹریٹ نے اپنا رومال ہلا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک کرب ناک چیخ اُبھری اور دم توڑ گئی۔

عزیزہ خالہ کو آخری لمحے میں جیسے کسی نے نیند سے ٹھنڈے برف پانی کی پوری بالٹی پھینک کر جگا دیا ہو۔ وہ ایک جھرجھری لے کر جاگیں اور زور سے چیخ پڑی تھیں۔

"معاف کر دیا..... میں نے اسے معاف کر دیا..... میں نے اسے اپنے اللہ کے واسطے اور اپنے طاہر کے صدقے معاف کر دیا..... معاف کر دیا....."

عزیزہ خالہ روتی جاتیں اور یہی گردان کیے جاتیں..... جلاد نے جلدی سے اُگو کے چہرے سے غلاف ہٹایا۔ پھانسی کا قیدی ویسے ہی ادھ مرا ہوتا ہے اور پھر جو قیدی پھانسی گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر پھندہ بھی گلے میں ڈلوا چکا ہو، اس کے حواس تو بالکل ہی غائب ہوتے ہیں۔ اس لیے اُگو کو بھی ہوش میں آنے اور یہ یقین کرنے میں بہت دیر لگی کہ اُسے طاہر بھائی کے ماں باپ نے بخش دیا ہے۔ چند لمحے تو وہ اجنبی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان سب کو دیکھتا رہا اور پھر جو وہ پتھر ٹوٹ کر رویا تو یوں برسا کہ اُس نے اپنے آس پاس کی ہر آنکھ کو ڈبو دیا۔ اُگو کی فلک شگاف چیخوں سے ساری جیل گونج رہی تھی اور وہ یوں بچوں کی طرح زار و قطار رو رہا تھا کہ جیسے اپنی عمر بھر کے آنسو آج ہی بہا دے گا۔ اس نے اپنا سر عزیزہ خالہ کے قدموں میں رکھ دیا اور اپنا سر زمین پر پٹخ پٹخ کر لہولہان کر دیا۔ اُس کے اندر کا انسان جاگا لیکن بہت دیر کے بعد.....

باہر جب اُگو کے ماں باپ کو اس کی زندگی کی نوید ملی تو انہیں سجدۂ شکر ادا کرنا بھی یاد نہیں رہا، وہ دونوں سجدے میں تو گرے لیکن تسبیح تک بھول گئے۔ یہ ایک ایسی شادیٔ مرگ کی کیفیت تھی جسے انسانی لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کا اپنا کوئی جگر کا ٹکڑا موت کی دہلیز کو چھو کر واپس پلٹا ہو۔

عزیزہ خالہ نے اُگو کی جان بخشی کر دی، لوگ ان کی عظمت کے ایسے قائل ہوئے کہ ان کی محبت عقیدت میں بدل گئی۔ چند دن بعد اُگو کو بھی اس راضی نامے اور معافی نامے کے بدلے جیل سے رہائی مل گئی کیونکہ اپنی قید کی سزا وہ پہلے ہی ان پانچ سالوں میں پوری کر چکا تھا، لیکن جیل سے باہر آنے والا اُگو وہ اُگو نہیں تھا جو اندر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں اور وہ ایک ایسا بدلا ہوا انسان تھا، جس نے اسی دنیا میں اپنی ہر غلطی کے مداوے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

اُگو کو تو قید سے رہائی مل گئی تھی لیکن اُس کی کرنی کی وجہ سے ڈوآپی جس قفس میں جا گری تھیں اس قید سے وہ کبھی رہائی نہیں پا سکیں۔ ظفر کے مطالبے دن بہ دن بڑھتے جا رہے تھے اور ان کے بوڑھے ماں باپ کے پاس اب ایسا کچھ نہیں بچا تھا جو وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی نذر کر سکتے۔ حتیٰ کہ غیاث چچا نے اپنا جی۔ پی فنڈ بھی دفتر سے نکلوا کر ظفر کی فرمائشوں کی نذر کر دیا تھا۔ لیکن ایک بے کار اور گھر میں چارپائی توڑتے ہوئے شخص جس کی جھوٹی شان اور دوستوں کے دکھاوے کے لیے لٹانے کی کوئی حد نہ ہو اس کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ہو تو کم پڑتا تھا، لہٰذا اس کی ڈوآپی سے تکرار بھی دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب تو اس کا ہاتھ بھی کھل چکا تھا لہٰذا وہ گاہے بگاہے ڈوآپی پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن ڈوآپی کو خدا نے جس مٹی سے بنایا تھا اس میں شکایت یا اُف تک کرنے کا خمیر شامل نہیں تھا۔ نہ ہی کبھی انہوں نے اپنے ماں باپ ہی کو اس بات کی کبھی بھنک بھی پڑنے دی کہ ان کی وہ بیٹی جسے اپنے گھر میں گرم ہوا نے بھی کبھی نہیں چھوا تھا اور جس کی زبان سے اُف نکلنے سے پہلے ہی ہر کوئی اپنی پلکیں اس کی راہ میں بچھا دیتا تھا وہ اب کس حال میں ہے۔ لیکن وہ نہ بھی بتاتیں تو کیا ہوتا؟..... غیاث چچا کی جہاندیدہ نظریں کیا ایسا ہر راز پانے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں؟ اور کیا ان کی چہیتی اماں، جو ماں ہونے سے زیادہ ان کی سہیلی بھی تھیں، کیا انہیں اپنی بیٹی اور سہیلی کی آنکھوں میں یہ سب کچھ دکھائی نہ دیتا ہوگا؟

ظفر کی چڑچڑاہٹ بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے اب اندازہ ہو چلا تھا کہ ڈوآپی کے میکے پاس انہیں دینے کے لیے اب کچھ نہیں بچا تھا، ان تلوں میں جتنا بھی تیل تھا وہ پہلے ہی نچوڑ چکا تھا۔ اُگو کا معاملہ اس کی پھانسی ٹلنے سے ایک بار پھر اٹھا تو اس کے ہاتھ ڈوآپی کو طنز اور طعنوں سے چھلنی

کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا، اب وہ بہانے بہانے سے اُنو اور طاہر بھائی کے جھگڑے اور قتل کا ذکر چھیڑ دیتا اور وجو کو گھائل کرنے کے لیے لفظوں کے ایسے ایسے تیر چلاتا کہ اس معصوم لڑکی کی سانس ہی رُکنے لگتی۔ کبھی کہتا کہ غیاث چچا نے اُسے دھوکے میں رکھ کر یہ شادی کروائی ہے۔ کبھی کہتا کہ اگر اُسے پہلے پتہ ہوتا کہ وجو کا قصہ طاہر بھائی کے ساتھ چل رہا ہے تو وہ کبھی اس گڑھے میں نہ گرتا۔ ظفر کمینگی کی اس حد تک گر چکا تھا کہ اس نے اُنو کے ساتھ بھی وجو کا نام جوڑ دیا اور اس کو عزیزہ خالہ کی طرف سے جو معافی ملی تھی، اُسے بھی اُس نے وجو کی کوششوں کے کھاتے میں ڈال دیا کہ ضرور انہوں نے محلے جا کر طاہر بھائی کے ماں باپ کو مجبور کیا ہوگا کہ اُنو کو معاف کر دیں، تاکہ ان کا ایک عاشق تو دنیا میں انہیں سراہنے کو زندہ باقی رہے۔

پھر ایک دن تو حد ہی ہوگئی جب ظفر نے باقاعدہ انہیں ہاتھ سے پکڑ کر باہر کے دروازے پر لا کھڑا کیا کہ یا تو گھر سے کچھ رقم لے کر آئیں یا پھر ہمیشہ کے لیے اُس کے گھر سے نکل جائیں۔ اور گھر بھی اس کا کہاں تھا۔ پچھلے پانچ ماہ سے مالک مکان روزانہ کرائے کے تقاضے کے لیے دروازے پر صبح سویرے ہی آن موجود ہوتا۔ ظفر خود تو اُس سے جان چھڑانے کے لیے اب باہر نکلتا ہی نہیں تھا اور بے چاری وجو کو شرمندہ ہونے کے لیے دروازے پر بھیج دیتا۔ وجو نے بھلا آج تک اپنی پوری زندگی میں ایسے معاملات کہاں جھیلے تھے۔ انہیں تو کسی غیر مرد سے بات کرنے کا کبھی کوئی اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ گھر میں تو فضلو بابا اور ان کے ابا ساری بیرونی دنیا سے ان کے رابطے کا ذریعہ تھے اور پھر میں بھی تو تھا۔ میں نے کبھی انہیں کسی ٹھیلے والے سے یا سائیکل رکشہ والے سے بھی کبھی بات نہیں کرنے دی تھی۔ جہاں کہیں رابطے کی ضرورت ہوتی میں، فضلو بابا یا غیاث چچا ہمیشہ ان کی مدد کو موجود ہوتے۔ پتہ نہیں مجھے کبھی بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ وجو کسی بھی ایرے غیرے مرد سے بات کریں۔ اس کام کے لیے ہم سب جو موجود تھے۔ خود وجو کو بھی میری اس عادت کا پتہ تھا اور جب کبھی رکشے یا تانگے والے کو کرایہ دینا ہوتا یا پھر محلے میں پھیری والے سے کچھ منگوانا ہوتا تو وہ پہلی آواز مجھے ہی دیتیں اور اگر میں اس وقت نہ بھی ہوتا تو کسی اور بچے یا فضلو بابا کے ذریعے کہلوا بھیجتیں۔

اب ایسے میں جب انہیں مالک مکان کو کرایہ نہ دینے کی تاویلیں پیش کرنا پڑتی ہوں گی تو وہ کس اذیت سے گزرتی ہوں گی۔ اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ مالک مکان اچھے خاندان سے تھا اور وہ ظفر کی عادات سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایک شریف گھرانے کی عفت مآب بیٹی اس کم ظرف کے گھر آ پھنسی ہے، اس لیے وجو کو دروازے پر دیکھ کر وہ زیادہ بحث کیے بنا ہی وہاں سے پلٹ جاتا تھا۔

لیکن گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کر لے تو پھر کھائے کیا.....؟ آخر کار پانچویں مہینے اُسے وجو آپی سے کہنا ہی پڑا کہ ان حالات میں تو اُس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ظفر کے نام وکیل سے کہہ کر نوٹس نکال دے کہ اگلی پہلی سے مجھے مکان خالی کر دے، ورنہ معاملہ پولیس میں دے دیا جائے گا۔ پولیس کا نام سن کر وجو آپی سراسیمہ ہوگئیں اور انہوں نے دروازے کی اوٹ سے پہلی مرتبہ مالک مکان، جنہیں وہ سب خان صاحب کہتے تھے، سے درخواست کی کہ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا ہے، کچھ دن کی مزید مہلت دے دیں، وہ کوشش کریں گے کہ جلد از جلد کرایہ اُتار دیں۔ خان صاحب نے جواباً کہا کہ وہ صرف وجو آپی کے کہنے پر ظفر کو مزید کچھ وقت دے رہا ہے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہے کہ ظفر کبھی ان کا کرایہ نہیں چکائے گا۔ اُس نے وجو آپی سے کہا کہ اُسے ان پر ترس آتا ہے کہ ایک عزت دار خاندان کی لڑکی یہ

کس ذلت کے گڑھے میں گر گئی ہے۔ اس نے ڈھو آپی کے سامنے ایک پیش کش رکھی جس سے اس کا کرایہ بھی ادا ہو جاتا اور خود ڈھو آپی کا ہاتھ بھی کچھ کھلنے کا آسرا ہونے کی امید تھی۔ ڈھو آپی نے کہا کہ وہ خان صاحب کی بات غور سے سن رہی ہیں۔ وہ کھل کر بات کریں۔ خان صاحب نے بتایا کہ ان کے ایک جاننے والے پشاور سے اس شہر میں اپنی تعیناتی پر آئے ہیں۔ عہدے میں ریل کے بڑے افسر ہوتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں، دس سال کا ایک بیٹا اور آٹھ سال کی ایک بیٹی، دوسرے صوبے سے ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم درمیان میں ہی منقطع ہو گئی تھی اور جب تک انہیں اس شہر کے اسکول میں داخل کروایا گیا تو تب تک دونوں بچے اصل کورس سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ خان صاحب نے ڈھو سے کہا کہ اُن کے دوست نے انہیں کسی ٹیوٹر کا بندوبست کرنے کا کہا ہے۔ اگر ڈھو مناسب سمجھیں تو دن میں دو گھنٹے ان کے بچوں کو پڑھا دیا کریں۔ اس طرح سے جو رقم انہیں فیس کے طور پر ملے گی اس کا آدھا وہ خان صاحب کو کرائے کے طور پر ادا کر دیا کریں اور آدھی رقم سے اپنا گھر چلا لیا کریں۔ خان صاحب نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوست سے کہہ کر ڈھو کا معاوضہ بھی دوسرے کسی ٹیوٹر سے کافی زیادہ مقرر کروا دیں گے۔ شاید مالک مکان بہت پہلے ہی ڈھو آپی کے لب و لہجے اور ان کے تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے اطوار سے یہ بات جان چکا تھا کہ ڈھو آپی اچھی خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ تبھی اس نے یہ پیش کش کی تھی۔ ڈھو آپی نے خان صاحب سے کہا کہ وہ اپنے میاں سے بات کر کے انہیں بتائیں گی۔ خان صاحب انہیں دعا دے کر واپس پلٹ گئے اور ڈھو آپی واپس پلٹی تو ان کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ظفر جانے کب سے ان کے پیچھے کھڑا ان کی اور خان صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ دراصل جب ڈھو کچھ دیر دروازے سے نہیں پلٹیں تو اس کی شکی مزاج طبیعت نے فوراً اس کے ذہن میں کھد بد شروع کر دی اور وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے وجو کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے وجو کی اور مالک مکان کی ساری باتیں سُن لی تھیں۔ ڈھو کو اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں، اسے اور کیا چاہیے تھا۔ گھر میں پڑے پڑے بیوی کی کمائی کھانے کا موقع مل رہا تھا۔ اُس نے ڈھو آپی کو حکم دیا کہ وہ کل سے ہی ٹیوشن پڑھانے کے لیے جانا شروع کر دیں اور کوشش کریں کہ دو تین ماہ کا معاوضہ ایڈوانس ہی مل جائے تو بہت اچھا ہو گا۔ اگلے دن خان صاحب آئے تو ڈھو نے ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن ساتھ ہی اپنے اکیلے جانے سے معذوری کا اظہار بھی کر دیا کہ انہوں نے کبھی اپنے میکے سے بھی اکیلے باہر قدم نہیں رکھا لہٰذا اگر ہو سکے تو بچوں کو شام یہیں ان کے گھر بھجوا دیا جائے تو بہتر ہو گا۔ خان صاحب نے بتایا کہ بچوں کا تو یہاں آنا ممکن نہیں ہو گا کیونکہ وہ دونوں بہت ضدی ہیں، اور بمشکل ٹیوشن پڑھنے پر ہی رضامند ہوئے ہیں۔ اب ایسے میں ان پر مزید کوئی شرط رکھی گئی تو بالکل ہی بدک جائیں گے ہاں البتہ ریحان صاحب (خان صاحب کے دوست) ہر روز شام چار بجے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت بھجوا دیا کریں گے جو دو گھنٹے بعد انہیں گھر واپس چھوڑ جایا کرے گی۔ ڈھو آپی کیا کہہ سکتی تھیں۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کے چپ ہو رہیں۔

غیاث چچا اور سکینہ خالہ کو جب ڈھو آپی کی نوکری کا پتہ چلا تو ان دونوں کے دل میں جیسے تیر سا گڑھ گیا۔ غیاث چچا تو ویسے بھی تقریباً بستر ہی سے لگ چکے تھے اور اب ان کی طبیعت زیادہ تر نڈھال ہی رہتی تھی۔ سکینہ خالہ بھی بہت دن تک چھپ کر روتی رہیں۔ جانے ان کی وجیہہ کی قسمت میں ابھی مزید کتنے عذاب جھیلنے لکھے تھے۔

پہلا انقلاب

چار ہفتے بعد ہم پانچوں کے پلستر کھل گئے اور دو دن کے بعد ہمارے سالانہ امتحانات شروع ہو گئے۔ یہ ہمارے اس کالج میں آخری امتحانات تھے۔ آج سے چھ سال پہلے جب میں اس کالج میں داخل ہوا تھا اس وقت کے پہلے امتحانات میں اور بارہویں جماعت کے ان امتحانوں میں کس قدر فرق تھا۔ اس وقت مجھے ٹھیک طرح سے یہ پارکر قلم بھی پکڑنا نہیں آتا تھا اور آج چھ سال بعد میں ہر مضمون کے سادہ جوابی پرچوں کی نہ جانے کتنی فاضل کاپیاں بھرتا جا رہا ہوتا تھا کہ کبھی کبھی تو میری سیٹ کے اردگرد کاغذوں کا اتنا بڑا انبار جمع ہو جاتا جسے پرچہ ختم ہونے کے بعد باندھنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا تھا اور ہم ممتحن کی منتیں کر کر کے اپنی فاضل کاپیاں (extra sheets) جلدی جلدی دھاگے سے باندھ کر اس کے حوالے کر دیتے۔

ہماری ساری ڈارمیٹری پڑھائی میں جت چکی تھی، اور تو اور موٹے بھٹی کو بھی کھانے کی سدھ بدھ تک نہیں رہتی تھی۔ ایک ایک کر کے ہمارے پرچے ختم ہو رہے تھے، امتحانات کے بعد پریکٹیکل ہونا تھے اور اس کے بعد آخر میں ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ، جس کے لیے ابھی سے کالج کی انتظامیہ نے ہمارے والدین اور گھر والوں کو دعوتی کارڈ بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔ صوبے کے گورنر صاحب مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لا رہے تھے، اور ہماری آخری پریڈ کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

پرچوں کے بعد ہمیں حسب معمول چھوٹی کلاسوں نے الوداعی رات کے کھانے دینا شروع کر دیئے۔ چھ سال پہلے جب ہم نے ساتویں جماعت کی طرف سے اس وقت کی بارہویں جماعت کے کیڈٹس کو الوداعی ڈنر دیا تھا تو ہم سب بچوں کے دل میں کتنی حسرت تھی کہ جانے یہ دن ہماری زندگیوں میں کب آئے گا جب ہمیں بھی کوئی الوداعی ڈنر دے کر رخصت کرے گا۔ کیڈٹ کالج کی ایک ریت یہ بھی تھی کہ الوداعی کھانے کی رات جونیئر کیڈٹس سینئر کیڈٹس بن جاتے اور کچھ دیر کے لیے سینئر کیڈٹ جونیئر بن کر ان کا ہر حکم مانتے تھے۔ چاہے وہ کچھ بھی کہیں۔ آصف بھٹی کو کہا گیا کہ ایک وقت میں چار روٹیاں اکٹھی کھا کر دکھائے۔ مجید چھوٹو کو ہیل والے جوتے پہن کر ڈانس کا کہا گیا۔ نثار روندو کو اس طرح رونے کا کہا گیا جیسے وہ سی پی او کے سامنے ایکسٹرا ڈرل کے دوران آنسو بہایا کرتا تھا۔ مجھے اور فیصل کو چھت پر چڑھ کر اس طرح اترنے کا کہا گیا، جیسے ہم بنک کرتے وقت اترا کرتے تھے، اسفر کو وہ مخصوص سیٹی بجانے کا کہا گیا جو ہم خطرے کے وقت بجایا کرتے تھے۔ ہم نے جونیئر کیڈٹس کی یہ ساری باتیں کسی حکم کی طرح بجا لائیں۔ تقریب ختم ہوئی تو سارے جونیئر کیڈٹس ہمارے گلے لگ گئے۔ سب ہی نے ایک ہی بات کہی کہ ہماری کلاس ان کے لیے ایک آئیڈیل کی سی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ انہوں نے یہاں جینے کا طریقہ ہم سے ہی سیکھا ہے۔ ہم نے سینئر ہونے کے باوجود کبھی جونیئرز کو رنگ نہیں کیا تھا۔ ہمیں اپنے ہی دھندوں سے فرصت کہاں تھی کہ کسی مظلوم جونیئر کیڈٹ کو رنگ کرتے۔ لیکن اس دن ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے جونیئر کیڈٹس کو ہم سے

کس قدر عقیدت تھی۔ فیصل اسٹیج پر آخری تقریر کے لیے آیا تو کچھ بولنے سے پہلے ہی رو پڑا۔ اس کے بعد ہم میں سے کوئی بھی اپنی الوداعی تقریر نہیں کر سکا۔ وہ اُترا تو میں بھی بھیگی آنکھیں لیے اسٹیج پر آیا اور کچھ ہی دیر میں ہمارا پورا ہاؤس رو رہا تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی جب ہم یہاں آئے تھے تو تب بھی رو رہے تھے اور اب جو جانے کا وقت آیا تھا تب بھی ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے دو مرتبہ اپنی ہچکی روک کر بات جوڑنے کی کوشش کی۔

''ڈیئر فیلو کیڈٹس Dear Fellow Cadet's..... آئی فیل پراؤڈ ٹو بی I feel proud 2b..... آئی..... ان فیکٹ.....''

لیکن پھر اس کے بعد مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ میں تیزی سے اسٹیج سے اتر آیا راستے میں فرسٹ ایئر کے کیڈٹس نے مجھے روک لیا اور سبھی میری آنکھیں پونچھتے پونچھتے خود بھی رونے لگ گئے۔ یہ کیسا رشتہ تھا جو آنسوؤں سے شروع ہوا تھا اور آج آنسوؤں پر ہی ایک نئے موڑ پر جدا ہو رہا تھا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیڈٹ کالج کے ان چھ سالوں میں میں نے پایا زیادہ تھا یا پھر کھویا زیادہ.....؟ میرا بچپن انہی راہداریوں میں، گھاس کے میدانوں میں اور پریڈ گراؤنڈ کے پتھریلے فرش پر بھاگتے دوڑتے گزر گیا تھا۔ میں جب یہاں آیا تھا تو ایک چھوٹا بچہ تھا اور آج جب میں یہاں سے واپس جانے کے قریب تھا تو ایک نوخیز اور نوجوان تھا، جسے اپنے بھلے بُرے کا اچھی طرح پتہ تھا۔

پرنسپل صاحب نے بھی ہمارے اعزاز میں الوداعی کھانا دیا اور اس میں انہوں نے اسٹیج پر آ کر خاص طور پر اُس بات کا ذکر کیا جب ساتویں جماعت میں انہیں مجھے روکنے کے لیے مختلف ڈرامے کرنا پڑے تھے۔ ہماری شرارتوں پر انہوں نے اس رات ہم سب کے کان بھی کھینچے ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہر وہ بات جو ہم اپنے تئیں یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے چھپا لی ہے، انہیں اس ہر بات کا پتہ تھا۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اُسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے اسفر کی جانب اپنے سگار کا پیکٹ بڑھایا۔ اسفر نے کسر نفسی سے کام لیا۔

''نو سر آئی ڈونٹ اسموک "No Sir I don't smoke"

انہوں نے مسکرا کر بخشوی پی او کو اشارہ کیا جو کھانے کی میز کی پرلی طرف کھڑا تھا۔ اُس نے جیب سے گولڈ لیف کا آدھا پیکٹ نکال کر اسفر کے حوالے کر دیا جو شاید کسی چھاپے میں اسفر کی الماری سے نکلا ہوگا۔ انہوں نے آہستہ سے اسفر سے کہا۔

''سگریٹ پینا بُری بات نہیں۔ صرف عمر اور برانڈ کا دھیان رکھنا چاہیے۔''

اسفر کا کندھا ٹھونک کر وہ آگے بڑھ گئے۔ دوسری جانب ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا اور دھیرے سے بولے۔

''کیڈٹ عباد..... تمہارے جونیئر سیکشن کی ٹیچر شیرل آج کل چھٹیوں پر اپنے گھر آئی ہوئی ہے..... تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گے۔ نائس گرل شی از..... Nice girl she is" غرض اس دن ہم میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جسے کمانڈر صاحب نے اپنے مخصوص شوخ لہجے میں چھیڑا نہ ہو۔ اُس دن ہم سب کو احساس ہوا کہ ہم سب کیڈٹس کی ٹریننگ میں کمانڈر صاحب کی خاموش تربیت کا کس قدر بڑا اور مرکزی حصہ شامل تھا۔ اس رات

میں نے کمانڈر صاحب سے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا سبق سیکھا اور وہ یہ کہ تربیت صرف چیخنے چلانے اور سزا دینے یا سزا کا خوف دل میں پیدا کرنے کا نام نہیں ہوتا۔ تربیت تو ایک خاموش انقلاب کا نام ہوتی ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جو آپ کی رُوح سے شروع ہو کر آپ کے جسم پر ختم ہوتی ہے، نہ کہ اُسے جسم کے رویّں کے ذریعے روح میں ٹھونسنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کمانڈر صاحب نے یہ خاموش انقلاب ہماری روحوں کے ذریعے ہمارے جسموں پر لاگو کر دیا تھا۔ اب اگر ہمارے فانی جسم مٹ بھی جاتے تو یہ انقلاب ہماری روحوں سے آگے منتقل ہو جاتا۔

ہمارے پریکٹیکل ختم ہو چکے تھے اور دو دن کے آرام کے بعد ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی۔ ہماری آخری پریڈ.....

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com
or
send message at
0336-5557121

دیر ہو جاتی ہے.....

اگلے دن سے ڈھو آپی کو حسبِ وعدہ ریحان صاحب کا ڈرائیور مقررہ وقت پر اپنی لمبی سی موٹر کار میں لینے کے لیے آنے لگا۔ پہلے دن تو ڈھو آپی کو یوں اکیلے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہوئے بہت گھبراہٹ ہوئی۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ظفر سے کہا بھی کہ پہلے دن وہ ان کے ساتھ چلے چلیں لیکن ظفر نے ایک ٹکا سا جواب دے دیا کہ اس کے سر میں صبح سے درد ہے لہٰذا وہ نہیں جا سکتا۔ البتہ اس نے اپنا دوسرا فریضہ یعنی طنز کے تیر چلانے کا کام بخوبی انجام دیا اور ڈھو آپی کو سینکڑوں مرتبہ یہ جتایا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کی نظریں ڈھو آپی کا تعاقب نہیں کر رہیں اور ڈھو آپی اس کی غیر موجودگی کا کوئی ''غلط فائدہ'' اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور سیدھے ٹیوشن پڑھا کر گھر واپس آ جائیں۔ وجو آپی سر جھکائے ظفر کی ہدایات سنتی رہیں۔ ظفر نے سختی سے انہیں منع کیا کہ کسی بھی مرد سے گھر یا باہر کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی دو گھنٹے سے ایک لمحہ بھی زیادہ باہر گزارنے کی انہیں اجازت ہے۔ جاتے جاتے اُس نے یہ دُہرانا بھی ضروری سمجھا کہ ڈھو آپی کو آج ہی اپنے معاوضے اور ایڈوانس کی بات بھی بچوں کے گھر والوں سے حتمی طور پر طے کرنی ہے۔ اس کی بک بک ابھی جاری ہی تھی کہ باہر گلی میں تیسری بار گاڑی کا ہارن بجنے کی آواز آئی اور مجبوراً ظفر کو اپنا ہدایت نامہ ختم کر کے وجو کو جانے کی اجازت دینی پڑی۔

ریحان صاحب کا بنگلہ ریلوے افسران کے بنگلوں کی قطار میں تیسرا تھا اور اُس کی لمبی سی روش سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک بڑے سے پورچ میں رُک گئی۔ ڈھو آپی کو نوکر نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب جو ایک پکی عمر کے سنجیدہ سے مرد تھے، اپنے دونوں بچوں شارق اور فائزہ سمیت آن موجود ہوئے، ڈھو کو دیکھ کر انہیں کچھ حیرت سی ہوئی کیونکہ وہ اپنے طور پر سمجھ بیٹھے تھے کہ خان صاحب نے کسی عمر رسیدہ یا پھر کم از کم کسی تجربہ کار اُستانی کا بندوبست کیا ہوگا لیکن یہاں تو دھان پان سی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، جسے اگر کالج کا یونیفارم پہنا دیا جاتا تو وہ خود بھی اسٹوڈنٹ ہی دِکھتی۔ ریحان صاحب نے اپنا اور دونوں بچوں کا تعارف کروایا اور پھر جب ڈھو آپی نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں ریحان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اپنی سی پوری کوشش کریں گی کہ جتنی جلدی ہو سکے، دونوں بچوں کو ان کی باقی کلاس کے برابر لا کھڑا کریں، تو ان کے لفظوں کے چناؤ اور ان کی تہذیب و شائستگی نے ریحان صاحب کا ڈھو کے بارے میں پہلا تاثر یکسر زائل کر دیا۔ خان صاحب نے شاید اشارۃً ریحان صاحب کو ڈھو کے گھریلو پس منظر کے بارے میں بھی بتا رکھا تھا، اسی لیے انہوں نے پہلے سے دو چیک کاٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک چیک خان صاحب کے نام تھا اور دوسرا ڈھو آپی کے نام، ڈھو کا طالب علمی کے دور کا وظیفوں والا بینک کا کھاتہ اب بھی چل رہا تھا اور غیاث چچا ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم اپنی تنخواہ میں سے اس کھاتے میں منتقل کرتے رہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شادی کے بعد ظفر نے کبھی ان کے کاٹے گئے چیکوں کے

بدلے ایک دمڑی بھی ان کی ہتھیلی پہ لا کر نہیں رکھی تھی۔ ظفر نے جب آدھی رقم کا چیک خان صاحب کے نام پر دیکھا تو وہ بہت تلملایا اور اس نے مالک مکان کو اس کی غیر موجودگی میں سخت سُست سنائیں لیکن شام کو جب خان صاحب کرائے کے تقاضے کے لیے آئے تو اس نے چپ چاپ چیک ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

یوں ڈھوکی گلی بندھی زندگی میں دو گھنٹے کی یہ تبدیلی ایسی آئی کہ انہیں بھی دو گھڑی کے لیے اس زندان سے چھٹکارا مل جاتا، بچے تو دو دن میں ہی ان سے یوں گھل مل گئے جیسے ان کی برسوں سے ڈھو سے دوستی ہو۔ دراصل بچے ان کے آنے سے پہلے اس لیے بھی سہمے ہوئے تھے کہ انہیں کسی عمر رسیدہ، موٹی موٹی عینکوں والی کسی ایسی سخت گیر استانی کی آمد متوقع تھی جس کے ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی یا لکڑی کا فٹ (اسکیل) دکھائی دیتا ہوگا، لیکن جب انہوں نے اس من موہنی سی، نازک سراپے والی ٹیچر کو دیکھا تو خود بہ خود اُس کی جانب کھچے چلے آئے۔ اور پھر ڈھو آپی کے پڑھانے کا انداز بھی تو کچھ ایسا تھا کہ اب دونوں بچے خود ٹیوشن کے وقت کا انتظار کرتے رہتے اور ایک اتوار کی چھٹی بھی انہیں اس قدر گراں گزرتی کہ وہ سوال کر کر کے اپنے پاپا کی ناک میں دم کر دیتے۔

ظفر کی جیب میں ڈھو کی نوکری سے پھر سے پیسے آنے لگے تو اُس نے بھی پھر سے اپنے پر پُرزے نکالنا شروع کر دیے۔ ڈھو آپی کو واپسی میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ باہر گلی میں نکل کر ٹہلنا شروع کر دیتا اور جیسے ہی ریحان صاحب کی گاڑی گلی میں داخل ہوتی وہ ڈھو آپی کے گاڑی میں سے اترنے سے پہلے ہی لپک کر قریب جا پہنچتا اور ڈرائیور اور آس پاس سے گزرتے راہ گیروں اور ہمسایوں کی پروا کیے بنا ہی اپنے ذہن کا گند اپنی زبان کے زہر کے ذریعے اُگلنا شروع کر دیتا۔ ''کہاں رہ گئی تھی.....؟ اتنی دیر کہاں لگا دی؟ گھر واپس آنے کو تمہارا دل نہیں کرتا؟ کس کے ساتھ گپ لگانے کے لیے رُک گئی تھیں؟'' اور جب ڈرائیور گاڑی موڑ لیتا تو اس کے جاتے جاتے اس پر بھی فقرہ چست ہو جاتا۔

''کہیں یہ حضرت ڈرائیور ہی تو لمبے راستے سے گھمائے لیے نہیں پھرتے تمہیں.....؟ اسی لیے ڈھو آپی کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی وہ گھر واپس پہنچ جائیں چاہے اس کے لیے انہیں ٹیوشن کچھ دیر پہلے ہی ختم کیوں نہ کرنی پڑے۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ریحان صاحب کو بھی کہلوا بھیجا تھا کہ ان کے میاں کو ان کے دیر سے گھر پہنچنے پر تشویش ہوتی ہے لہٰذا اگر وہ چاہیں تو پیسوں میں سے کچھ کٹوتی کر لیا کریں لیکن انہیں گھر دس پندرہ منٹ پہلے ہی جانے کی اجازت دے دی جائے۔ ریحان صاحب خود بھی صورت شناس تھے اور کچھ ڈرائیور نے بھی انہیں دفتر لاتے لے جاتے ظفر کے اس بُرے رویے کی شکایت اپنے مالک سے کر رکھی تھی لہٰذا خود ان کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی ڈرائیور ڈھو کو گھر واپس پہنچا آئے۔ حالانکہ بعض مرتبہ بچوں کی صورتیں ان کے یوں بیچ میں چلے جانے سے رونی سی بن جاتیں کیونکہ وہ اپنی معصوم سی خوشیوں میں اپنی ٹیچر کو بھی شامل کرنا چاہ رہے ہوتے لیکن اُن کی ٹیچر تو لپکتے جھپکتے آتیں اور ان کی پڑھائی ختم کروا کر پلک جھپکنے میں ہی واپس چلی جاتیں۔ اس دن بھی جب فائزہ کی سال گرہ تھی تو ان کو سب نے کتنا رُکنے کا کہا لیکن وہ نہیں رُکیں اور چند دن پہلے جب شارق کو اسکول میں اس کے مضمون پر پہلا انعام ملا تھا، جس کی تیاری اس کی وجیہہ ٹیچر نے ہی کروائی تھی، تو ان دونوں نے کس طرح منہ بسور بسور کر ٹیچر کو بھی اپنے ساتھ اپنے پاپا کی جانب سے انعام میں دی گئی آئس کریم پارٹی میں چلنے کی منتیں کی تھیں، لیکن پھر بھی وہ مسکرا کر اور دونوں کے گال پر پیار کر کے واپس چلی گئی تھیں۔

لیکن اتنی احتیاط کے باوجود قدرت کی جانب سے آئی ہوئی رکاوٹیں تو اپنی جگہ موجود رہتی تھیں، کبھی ٹریفک کا رش، کبھی موسم کی خرابی، کبھی مشین کے کل پرزوں کی مجبوری، اُس دن بھی بھری دوپہر میں ہی اچانک کالے بادل یوں آناً فاناً آسمان پر چھائے کہ چند ہی لمحوں میں دن میں اندھیرا سا چھا گیا۔ ڈوآپی ابھی یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ کسی طرح آج ڈرائیور سے کہلوا دیں کہ آج انہیں لینے نہ آئے، لیکن اُسی لمحے گلی میں گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا۔ ڈرائیور نے دونوں بچوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی ڈوآپی کو تھما دی جس میں ان دونوں نے اپنے کل کے ٹیسٹ کے بارے میں لکھا تھا، جس کی تیاری آج ضروری تھی۔ مجبوراً ڈوآپی کو گھر سے نکلنا ہی پڑا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، راستے میں ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور ڈوآپی کے ریحان کے گھر سے نکلتے نکلتے سڑکیں ندیاں بن چکی تھیں۔ ڈرائیور بیچارہ نہ جانے کن گلیوں کے بیچ اور آڑھے ترچھے راستوں سے گاڑی نکالتا ہوا کسی نہ کسی طرح انہیں گھر تک پہنچا تو لایا لیکن اس اثناء میں وجو کے مقررہ وقت سے تقریباً آدھا گھنٹہ زیادہ ہو چکا تھا اور ظفر اپنے لال بھبھوکا چہرے سمیت گلی میں ہی برستی بارش میں ٹہل رہا تھا۔ پہلے تو اُس نے ڈرائیور کو ہی روک لیا اور اس پر برس پڑا کہ وہ ان کی بیوی کو لے کر کہاں گھومتا پھر رہا تھا۔ ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی اور ڈوآپی نے ظفر کے لاکھ ہاتھ جوڑے، منتیں کیں کہ یوں گلی میں سر بازار تماشہ نہ بنائے لیکن اس دن ظفر بھی اپنی کرنی پر آیا ہوا تھا۔ ڈرائیور کو تو اُس نے بسیار کوشش کے بعد جانے دیا لیکن ڈوآپی کے ساتھ اُس نے اس شام جو برتاؤ کیا اُس کے نشان ان کی روح سے تا عمر نہیں مٹ پائے۔

مصیبت یہ بھی تو تھی کہ اگر ڈوآپی ظفر کی خوشی کے لیے ٹیوشن چھوڑنا بھی چاہتیں تو یہ بھی ظفر کو گوارہ نہیں تھا کیونکہ اُسے گھر بیٹھے ہر مہینے ایک معقول رقم سے جو ہاتھ دھونا پڑ جاتے، اور وہ یہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب تو اسے مالک مکان کی دھمکیوں کا بھی روزانہ سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ ڈو کی تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ بھی آسانی سے، چاہے قسطوں میں ہی سہی، پر ادا ہو رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے ڈو نے مزید احتیاط شروع کر دی اور موسم ذرا بھی خراب ہونے کا احتمال ہوتا وہ یکسر جانے سے ہی انکار کر دیتی تھیں۔ لیکن ظفر کے پاس انہیں ستانے کے لیے بہانے اور بہت تھے۔ دراصل ظفر کے اندر کا انسان ایک ایسی عجیب احساسِ کمتری کا شکار تھا، جس میں انسان اپنے مخالف کی خاموشی کو بھی طنز سمجھتا ہے۔ اُسے اس بات کا احساس تو پہلے دن ہی سے تھا کہ ڈوآپی شکل وصورت، تعلیم وتہذیب اور آداب واطوار میں اس سے کہیں آگے ہیں۔ لیکن ڈوآپی نے آج تک کبھی اُس کے سامنے کبھی کوئی ایسی حرکت یا بات نہیں کی تھی جس سے ظفر کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہو۔ لیکن ظفر کے اندر کے خناس نے اسے ڈوآپی کی اس خاموشی کو بھی کچھ اور ہی معنی دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ یوں چپ رہ کر ڈو اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ جیسے اُس کے وجود کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اس بات سے اور اس احساس سے اس کی انا کو مزید ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر مزید انتقامی کارروائیاں کر کے اپنی زخمی انا کو سہلانے کی کوشش کرتا۔

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے اور زندگی دن بدن یونہی ڈوآپی پر تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ بیچ میں ایک آدھ مرتبہ ظفر نے ایک اور عجیب حرکت بھی کی۔ ڈوآپی کے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہی وہ بنا بتائے خود ہی کچھ دیر بعد ریحان صاحب کے بنگلے پر آن دھمکا۔ ایک مرتبہ تو گھر میں کوئی اور بڑا نہیں تھا اور صرف مالی ہی باہر کے باغیچے میں کام کر رہا تھا جس سے اُس نے ٹوہ لے لی کہ ڈو وہیں اندر ہیں اور بچوں کو پڑھا رہی ہیں۔ ایک آدھ

مرتبہ ڈرائیور نے خود اسے بنگلے کے باہر ٹہلتے ہوئے دیکھ لیا لیکن ڈرائیور کے باہر نکلنے سے پہلے ہی ظفر اِدھر اُدھر ہو گیا۔ جبکہ ایک مرتبہ اس کے گھنٹی بجانے پر خود ریحان صاحب گیٹ پر آ گئے کیونکہ وہ قریب ہی لان میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ظفر انہیں دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا لیکن جب اس نے ڈھو آپی کے شوہر کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا تو ریحان صاحب نے بڑی عزت سے انہیں اندر بلا کر بٹھایا اور چائے وغیرہ کا پوچھا۔ ظفر کو اور تو کچھ سوجھا نہیں لہٰذا اس نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ یہاں سے گزر رہا تھا تو اس نے سوچا کہ ڈھو کو ساتھ ہی لیتا جائے۔ ریحان صاحب نے ان دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر واپس بھجوایا اور نہ صرف یہ بلکہ جاتے ہوئے گھر کی ملازمہ کو یہ تاکید بھی کی کہ انہیں خالی ہاتھ نہ جانے دے اور فریج میں پڑا تازہ کیک بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔

اس دن ظفر کو پہلی بار یہ پتہ چلا کہ ریحان صاحب کی بیوی تو انہیں پانچ سال پہلے ہی داغ مفارقت دے چلی ہیں اور اب اس گھر میں ڈرائیور اور مالی کی بیوی کے علاوہ تیسری کوئی عورت نہیں رہتی۔ ظفر نے گھر آ کر اس بات پر بھی بے حد ہنگامہ کیا کہ ڈھو نے یہ بات انہیں پہلے کیوں نہیں بتائی۔ ڈھو آپی نے اُسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ بھلا اس بات سے ان کا کیا تعلق کہ بچوں کی ماں زندہ اور گھر میں ہے یا نہیں۔ ان کی تو ریحان صاحب سے بھی شاذ و نادر ہی کبھی ملاقات ہوتی تھی ورنہ ان کا تعلق تو اصل میں ان کے بچوں کے ساتھ تھا، لیکن وہ ظفر ہی کیا جو ڈھو آپی کی سُن لے..... کئی دن تک یہ تکرار چلتی رہی اور کئی دن تک روزانہ ڈھو آپی کو ایک نئی سُولی پر ٹنگنا پڑتا۔

اور پھر آخر کار ایک دن اس تکرار کی جلتی پر تیل چھڑکنے کا موقع قدرت نے خود ہی ظفر کو فراہم کر دیا۔ ڈھو آپی بچوں کو پڑھا کر اپنے مقررہ وقت ساڑھے پانچ بجے پورچ میں نکلیں تاکہ حسب معمول ڈرائیور انہیں چھ بجنے تک گھر پہنچا دے تو یہ دیکھ کر ان کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی کہ پورچ میں نہ تو ڈرائیور تھا اور نہ ہی گاڑی کا کچھ اتہ پتہ تھا۔ مالی اور گھر کے دوسرے نوکروں کو ادھر ادھر دوڑایا گیا تاکہ وہ ڈرائیور کی کچھ خبر نکال کر لائیں لیکن ڈرائیور کا دُور دُور تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈھو کا رنگ پیلا پڑتا گیا۔ بالآخر شام چھ بجے کے قریب ڈرائیور تو نہیں پلٹا لیکن ریحان صاحب اپنی سرکاری جیپ میں دوسرے ڈرائیور سمیت گیٹ سے اندر داخل ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظر راہداری میں بے چین اور نڈھال سی ٹہلتی ڈھو پر پڑی۔ اسی اثنا میں ڈرائیور بھی نہ جانے کہاں سے ہڑبڑایا ہوا سا گولی کی سی تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔ ریحان صاحب سارا معاملہ خود ہی سمجھ گئے اور انہوں نے ڈرائیور کو سخت جھاڑا کہ جب اُسے سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ جب تک بچوں کی ٹیچر کو واپس اپنے گھر نہ پہنچا دیا جائے تب تک وہ بھول کر بھی اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش نہ کرے پھر وہ کار لے کر باہر کیوں گیا۔ ڈرائیور وہیں ریحان صاحب کے پیروں میں گر گیا کہ اچانک ہی اسے خبر ملی کہ اس کی بہن کا بیٹا پتنگ لوٹتے ہوئے سڑک پر کسی موٹر سائیکل سوار سے ٹکرا گیا ہے اور اس کے سر سے تیزی سے خون بہہ رہا ہے تو وہ رُک نہیں پایا اور بہن کے گھر کی طرف دوڑا چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ قریبی ہسپتال سے بچے کی پٹی کروا کر ساڑھے پانچ بجے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے گا لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا اور بچے کے سر میں ٹانکے لگنے کی وجہ سے اُسے دیر ہو گئی۔

بہر حال وجہ جو بھی تھی، دیر تو ہو ہی گئی تھی۔ ریحان صاحب نے ڈرائیور کا معاملہ تو بعد پر اُٹھا رکھا، فی الحال انہیں ڈھو آپی کو گھر پہنچانے کی جلدی تھی۔ سو انہوں نے ڈرائیور کو جلدی سے فوراً گاڑی نکالنے کا کہا اور خود بھی ڈرائیور کے ساتھ ہی آگے بیٹھ گئے کیوں کہ انہیں معاملے کی سنگینی کا

احساس تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ خود جا کر ظفر کو اس صورتِ حال سے آگاہ کریں تا کہ وہ ڈوآپی پر برہم نہ ہو۔ وہیں بے چاری ڈوآپی تو ان کے جسم کا خون تو ویسے ہی خشک ہو چکا تھا لہٰذا چپ چاپ بیٹھی اپنے مقدر کا سامنا کرنے کی تیاری کرتی رہیں۔

جب ریحان صاحب کی گاڑی ظفر کی گلی میں مڑی تو اس وقت شام کے سات سے کچھ اوپر ہی وقت ہوا ہوگا۔ گلی سنسان پڑی تھی اور سردیوں کے دن ہونے کی وجہ سے شام بھی گہری رات ہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ڈوآپی کو درود شریف سمیت اور جتنی بھی دعائیں آتی تھیں، انہیں وہ سینکڑوں مرتبہ دل میں دُہرا چکی تھیں۔ ریحان صاحب نے ان سے کہا کہ وہ یہیں باہر گلی میں گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں، تب تک وہ جا کر اندر سے اپنے میاں کو باہر بھیج دیں۔ ڈوآپی نے ایک مرتبہ پھر اُن سے اصرار کیا کہ انہوں نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے، یہی بہت ہے، اب مزید زحمت کی ضرورت نہیں کیونکہ اب وہ اپنے گھر خیریت سے پہنچ گئی ہیں۔ دراصل ڈوآپی کے ذہن میں یہ خوف بھی کہیں نہ کہیں پل رہا تھا کہ ظفر ریحان صاحب کے سامنے ہی کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھے لہٰذا اس لیے بھی وہ ان دونوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن ریحان صاحب نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ظفر سے مل کر ہی گھر واپس جائیں گے۔ انہیں اس پریشان سی کومل لڑکی کو یوں اکیلے چھوڑ کر واپس جانا کسی طور بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

مجبوراً ڈوآپی ہی کو ہار ماننا پڑی اور وہ گاڑی سے اتر کر اپنے دروازے کی جانب بڑھ گئیں، لیکن یہ کیا.....؟ دروازے پر ایک موٹا سا تالا پہلے سے لٹکا ڈوآپی کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے ظفر اس وقت کہاں چلا گیا تھا؟ جبکہ اسے پتہ بھی تھا کہ ڈوجو کے پاس چابی بھی نہیں ہے، پھر اس اندھیری رات میں وہ گھر کو تالا کیوں لگا گیا تھا؟ ڈوجو کی پریشانی دیکھ کر ریحان صاحب بھی نیچے اتر آئے اور وہ بھی تالا دیکھ کر حیران تھے کہ اب کیا کریں۔ ڈوآپی کو تو ظفر نے آج تک آس پاس کسی ہمسائے کے گھر بھی آنے جانے نہیں دیا تھا نہ ہی وہ گلی میں کسی سے واقف تھیں۔ اس لیے ریحان صاحب نے طے کیا کہ ظفر کے آنے تک وہ سب یہیں گاڑی میں اس کا انتظار کریں گے، کیونکہ ڈوآپی کو یوں دروازے پر تنہا بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

لیکن انہیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے جب مزید دو گھنٹے گزر گئے تو ریحان صاحب نے ڈوکو ان کے اپنے گھر چھوڑنے کی پیش کش کی کیونکہ ظفر کا تو دُور دُور تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہمسایوں کے ہاں رات بھر انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ ڈو اپنے گھر میں ہی انتظار کریں بعد میں غیاث چچا خود ہی ظفر کا پتہ لگا کر انہیں گھر چھوڑ آتے۔ ڈوآپی کے پاس ہاں کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ لہٰذا وہ چپ چاپ سر جھکائے واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں اور ریحان صاحب انہیں ان کے میکے چھوڑ آئے۔ غیاث چچا کو انہوں نے باہر بلا کر پوری بات سمجھا دی تھی۔ وہ بے چارے بھی کیا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ ساری رات ظفر کے مختلف ٹھکانوں پر اسے تلاش کرتے رہے۔ وہ رات اور بہت سی راتوں کی طرح ڈوآپی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی اور تبھی آدمی کی تصویر کے نیچے رکھے کارڈ (Invitation) پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ یہ آدمی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کا دعوت نامہ تھا۔ کل صبح آدمی کی پاسنگ آؤٹ تھی اور کل کیا؟ صبح تو ہو ہی چکی تھی..... گھڑی صبح کے چار بجا رہی تھی۔

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

تیسرا الوداع

صبح کے چار بجتے ہی سی۔ پی۔ او نے بگل بجوا دیا۔ لیکن ہم سب کی آنکھوں میں نیند پہلے ہی کہاں تھی، یہ صبح کیڈٹ کالج کی دوسری صبحوں سے کتنی مختلف اور کتنی اہم تھی، اس کا اندازہ صرف ہم پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹ ہی لگا سکتے تھے۔ ہمارے کلف لگے کڑک خاکی یونیفارم اور ہماری کیپ بیرٹس، پر لگے رنگین پروں (پلومز) کے ساتھ جڑی ہماری الماریوں میں رات ہی کو ٹانگ دی گئی تھیں، ہمارے لانگ پریڈ شوز چم چم کرتے شوریکس پر سجے ہوئے تھے۔ باہر پریڈ گراؤنڈ میں الوداعی ترانے بجنا شروع ہو گئے تھے۔ آج ہمارا ناشتہ صبح چھ بجے ہی پیش کر دیا جانا تھا تاکہ ہم واپس آ کر اپنے یونیفارم پہنیں اور اپنی آخری تیاری کر کے پریڈ گراؤنڈ جا پہنچیں۔ ہم سب بیک وقت اُداس بھی تھے اور خوش بھی..... ہم ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کی آنکھ میں چُھپی نمی نہیں دیکھنا چاہتا تھا، سارے کیڈٹس ایک دوسرے کے ہاسٹلز جا کر اپنے گھر کے پتوں اور ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ کر رہے تھے تاکہ مستقبل میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھ سکیں۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمارے گھر والوں میں سے کون کون ہماری پاسنگ پریڈ دیکھنے کے لیے گراؤنڈ میں پہنچ چکا ہوگا کیونکہ مہمان پریڈ سے صرف دو گھنٹہ پہلے ہی کالج آ سکتے تھے اور انہیں وہیں گیٹ سے ان کے کارڈز کے حساب سے باعزت طور پر پریڈ گراؤنڈ میں ان کی کرسی تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ مجھے تو گھر سے کسی کے آنے کی کچھ کم ہی اُمید تھی کیونکہ ابا اور امی اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتے تھے اور عمارہ اور فاران بھیا اکیلے آ نہیں سکتے تھے۔ لیکن باقی کیڈٹس اور میرے دوستوں کے گھر سے بھی آ رہے تھے۔ اور اب اُنہی کے خاندان میرے خاندان بھی تو تھے۔ چھ سال سے ویک اینڈز پر اور دو چار دن کی کم چھٹیوں میں میں کبھی فیصل کے گھر تو کبھی اسفر کے گھر جاتا رہا تھا، کبھی آصف موٹے کی امی کے ہاتھ کے پراٹھے کھائے تو کبھی نثار روندو کے گنے کے کھیتوں سے گنے توڑ کر کھاتے کھاتے میرا بچپن میرے انہی دوستوں کے گھر والوں کے ساتھ بیت گیا تھا۔ اور ان سب کی ''امیاں'' اور ابا مجھے بھی اپنا ''ریڈی میڈ'' بیٹا ہی تو سمجھتے تھے۔ اسفر کے ڈیڈی سے تو میں اسفر سے بھی زیادہ جیب خرچ اینٹھ لیتا تھا اور فیصل کی ممی چھٹیوں میں فیصل کی نہیں بلکہ میری مرضی کا کھانا بنایا کرتی تھیں۔ آصف بھٹی کے ''بابے'' نے مجھے کبڈی اور داؤ لگانا سکھایا تھا اور نثار روندو کے ابا سائیں نے مجھے گاؤں کے کھیتوں میں شکار کھیلنے کے جانے کتنے گُر بتائے تھے، میں ان سب کا لاڈلا آدمی تھا، جسے انہوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اپنے گھر اور اپنے ماں باپ سے دور ہے۔ اور میرے لیے میرے یہ رشتے، کسی بھی خون کے رشتے سے کم نہیں تھے۔

آخری بگل بج چکا تھا اور اب ہم سارے سینئر پاسنگ آؤٹ کیڈٹس لمبی لمبی قطاروں میں اپنے اپنے ہاسٹل سے نکل کر پریڈ گراؤنڈ جانے کے لیے باہر فالن کی تیاریاں شروع کر چکے تھے۔ ہاسٹل کے دونوں طرف راستوں میں ہمارے جونیئرز ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے اور الوداعی

کارڈ لیے ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے جانے کب سے تیار کھڑے تھے، انہی میں ساتویں جماعت کے وہ چنو، منو، ہیلو، پپو، سونو، مونو قسم کے کیڈٹس بھی تھے، جو آنکھوں میں وہی حیرت اور فخر آمیز سی روشنی لیے کھڑے ہمیں تک رہے تھے جو کبھی ساتویں جماعت میں ہماری آنکھوں میں اپنے سینئرز کو یوں سجے سنورے آخری پریڈ پر جاتے ہوئے دیکھ کر لہرائی تھی۔ انہی میں سے ایک ننھا سا تارہ آگے بڑھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلدستہ میری طرف بڑھا دیا۔

''آدی سر..... دِس از فار یو "This is for you

میں نے اس معصوم تارے سے گلدستہ لے لیا اور پھر اُسے ایڑیاں بجا کر ایک کڑک دار سا سلیوٹ کیا۔ سبھی ننھے تارے کھلکھلا کر ہنس دیے۔ اُس نے اپنی آٹوگراف بک آگے کر دی اور میں نے اپنی زندگی کے پہلے آٹوگراف کاغذ پر ثبت کر دیے۔

''جیتے رہو ہمیشہ.....''

ہم سب پریڈ گراؤنڈ میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ سی۔ پی۔ او نے وسل بجائی اور ہم نے پریڈ کی فارمیشن ترتیب دے دی۔ مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اور بینڈ والے نے اپنے پورے 72 بہتر اوزاروں سمیت اپنی فوج کو دھن شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ بینڈ پر چوٹ لگی اور ایجوٹینٹ نے سی۔ پی۔ او کو اجازت دینے کے لیے اپنی اسٹک لہرائی۔ پریڈ شروع ہو گئی۔ ہم سارے پاسنگ آؤٹ کیڈٹ اپنے اپنے ہاؤس کے جھنڈے تلے اپنے پی۔ او۔ سمیت پریڈ کرتے ہوئے اس چبوترے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں گورنر صاحب، پرنسپل اور ایجوٹینٹ سمیت کھڑے ہم سے سلامی لینے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم گھوم کر اب اس قطار میں چل رہے تھے جس کے بالکل سامنے مہمانوں کا پنڈال تھا۔ تمام کیڈٹس کے گھر والے انہیں پہچان کر ان کی جانب دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلا رہے تھے کہ آج ان کے جگر کا ٹکڑا زندگی کے ایک بہت بڑے امتحان میں سُرخرو ہو کر ان کا مان بڑھا رہا تھا۔ ہم نے ڈائس کی طرف گھوم کر سلامی کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ سلامی دراصل تمام کیڈٹس کی اپنے گھر والوں اور پیاروں کے لیے بھی تھی جو دُور سے انہیں دیکھ کر خوشی سے نعرے لگا رہے تھے، ان کے نام پکار رہے تھے۔ دفعتہً میرے کانوں میں بھی ایک آواز اُبھری ''آدی..... آدی.....''

میں نے سلامی دیتے ہوئے بھیڑ میں نظریں دوڑائیں اور کچھ پل کے لیے میرا خود اپنی آنکھوں سے اعتبار اٹھ گیا۔ دُور تیسری قطار میں امی کھڑی تھیں۔ ہاں ہاں..... وہ میری امی ہی تھیں۔ میری پیاری امی..... جو اس وقت بھی اپنے مخصوص کالے برقعے میں ملبوس تھیں اور اتنے بہت سارے غیر مردوں کی موجودگی کی وجہ سے صرف اپنی بھیگی آنکھوں سے پلو ہٹائے کھڑی تھیں اور ان کا ایک ہاتھ میری جانب یوں اٹھا ہوا تھا، جیسے وہ اتنی دور سے بھی اپنے راجہ بیٹے کو بھیڑ میں ٹھوکر کھا کے گرنے سے روک لینا چاہتی ہوں..... یا اللہ یہ کیسا معجزہ ہے۔ پھر میری نظر امی کے ساتھ کھڑے فاری بھیا پر پڑی۔ مجھے آواز دینے والی آواز اُنہی کی تھی۔ ارے..... یہ کیا..... ان کے ساتھ عمارہ بھی کھڑی پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اور پھر میری نظر عمارہ کے ساتھ کھڑے چوتھے شخص پر پڑی۔ مجھے اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ اگر میں فوراً اپنے قدم سنبھال نہ لیتا تو ضرور پوری کی پوری پریڈ کے قدم توڑ کر سب کی پریڈ برباد کر دیتا۔ عمارہ کے ساتھ ابا کھڑے تھے..... ہاں ہاں..... میرے ابا..... وہ کیسے یہاں تک آ پہنچے۔ اتنا لمبا سفر، امی کی بیماری، عمارہ کے امتحانات، کوئی وجہ بھی تو ان کے قدم روک نہیں پائی تھی۔ کون کہتا ہے کہ میرے ابا مجھ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ دیکھو..... وہ کھڑے ہیں

میرے ابا..... وہ رہیں میری پیاری امی جو اپنے آدمی کی سلامی لینے یہاں تک آ پہنچی تھیں۔ شاید اپنی زندگی کا سب سے لمبا سفر طے کر کے۔ ابا نے مجھے دیکھ کر ہلکے سے ہاتھ ہلایا۔ ان کی آنکھوں کی نمی میں یہاں سے بھی محسوس کر سکتا تھا، لیکن یہ نمی خوشی کی نمی تھی۔ ان کے آدمی نے آج وہ کر دکھایا تھا جو ان کا خواب تھا۔ لوگ بیٹوں سے بھلا اور کیا چاہتے ہوں گے.....؟ فخر کا یہی کچھ لمحوں کا احساس، غرور کی چند گھڑیاں..... جو ان کی ساری زندگی پر بھاری ثابت ہوتی ہیں..... میری اور ابا کی آنکھیں ملیں۔ میری آنکھوں سے صدیوں کا رکا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔ میرے قدم پریڈ کی پیٹ پر اٹھ رہے تھے، میرا ہاتھ ماتھے پر سلامی کے لیے جما ہوا تھا لیکن میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں کہ آج ہی اندر کا ہر دریا نکال کر ہی دم لیں گی۔ امی نے دور سے مجھے اشارہ کیا کہ میں نہ روؤں پر وہ۔ خود بھی تو رو رہی تھیں۔ عمارہ مجھے دیکھ کر منہ چڑا رہی تھی لیکن وہ بھی تو رو رہی تھی۔ فاری بھیا جو ایسے موقعوں پر بہت بہادر بنتے تھے، آج تو وہ بھی بنا چہرہ چھپائے یوں رو رہے تھے کہ ان کے گالوں پر بہتے آنسو مجھے اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

سی۔ پی۔ او زور سے چیخا "کیڈٹ آخری سلامی دے گا"..... سلاآآآم فن۔"

ہمارے ہاتھ تیزی سے ہوا میں لہرائے، ماتھے تک گئے اور نیچے گر گئے۔ میرے دل نے سرگوشی کی۔

"الوداع اے میری رہنما..... اے میری تربیت گاہ..... الوداع....."

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تیسرا دَور

دوسری قیامت

پاسنگ آؤٹ کے بعد کیڈٹ کالج کو الوداع کہہ کر جب میں اپنے گھر والوں سمیت اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو سب سے پہلی خبر جس نے میرا یوں استقبال کیا کہ میرے ہوش وحواس ہی چھین لیے، میں نے راجہ کی زبانی وہیں پلیٹ فارم پر سُنی۔

''ڈوآپی کو طلاق ہوگئی.....

مجھے یوں لگا کہ جیسے پورا ریلوے اسٹیشن ہی گھوم رہا ہے اور ابھی چند لمحوں میں میرے سر پر آ گرے گا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ راجہ بول کیا رہا ہے۔ امی بھی محلے میں داخل ہوتے ہی تانگے سے اتر کر جلدی سے غیاث چچا کے گھر کی طرف بڑھ گئیں۔ اسٹیشن پر راجہ کے ساتھ مُنشی، نھو، گڈو، بالے اور پپو بھی مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اور وہ سب ہاتھوں میں ہار لیے یوں میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے جیسے میں اکیڈمی سے نہیں، مکہ مکرمہ سے حج کر کے آیا ہوں۔ بہر حال میری ساری خوشی اور دوستوں سے ملنے کی مسرت اس خبر سے غائب ہو چکی تھی اور ہم سب راجہ کے گھر کی بیٹھک میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں بالکل خاموش تھا اس لیے وہ سارے بھی چُپ تھے۔ پھر راجہ نے ہی پہل کی اور مجھے تین دن پہلے کی شام کا وہ سارا قصہ بتایا جب ڈوآپی کو ریحان صاحب کے ڈرائیور کی وجہ سے گھر لوٹنے میں دیر ہوگئی تھی اور ریحان صاحب خود انہیں گھر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن ظفر کے گھر پر نہ ہونے اور دروازے پر تالا پڑے ہونے کی وجہ سے آخر کار دیر رات انہیں ڈوکو ان کے اپنے گھر چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ غیاث چچا ریحان صاحب کے جاتے ہی ظفر کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے اور ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رات دو بجے وہ ظفر کی گلی میں پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں سے ہو کر گزرے تھے لیکن تب دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ظفر کے ایک آدھ ٹھکانے کا پتہ وہ جانتے تھے، لگے ہاتھوں انہوں نے اس کے پرانے شوروم کا بھی چکر لگا لیا لیکن سب طرف سے ایک ہی جواب ملا کہ ظفر وہاں نہیں آیا۔ مایوسی کے عالم میں گھر لوٹنے سے پہلے انہوں نے آخری امید کے طور پر دوبارہ ظفر کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور جیسے ہی ان کا اسکوٹر گلی میں مڑا انہوں نے ظفر کا دروازہ کھلا دیکھ لیا۔

غیاث چچا جلدی سے اسکوٹر لاک کر کے اترے اور دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد ظفر نے اندر سے دروازہ کھولا اور سر نکال کر باہر جھانکا اور غیاث چچا کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں بنا کسی سلام دعا کے بولا۔

''اوہ.....تو آپ ہیں.....کیا آپ بھی اپنی لاڈلی بیٹی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں.....میرے خیال میں تو اسے اب تک آپ کے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

غیاث چچا کچھ حیران بھی ہوئے کہ جب ظفر کو پتہ بھی ہے کہ وجو اپنے گھر میں ہیں تو یہ انہیں لینے کیوں نہیں آیا۔

''ہاں بیٹا..... وہ تو کب سے گھر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ دراصل ٹیوشن سے واپسی پر کچھ دیر ہو گئی تھی۔ یہاں پہنچی تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، اس لیے ریحان صاحب اُسے ہماری جانب چھوڑ چلے آئے..... چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں..... وجیہہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

ظفر کے چہرے پہ ایک زہر خندی مسکراہٹ ابھری۔

''اوہ..... ریحان صاحب..... تو وجیہہ کو لانے لیجانے کا فریضہ اب بڑے صاحب نے خود سنبھال لیا ہے..... بہتر ہوتا وہ اسے آپ کے گھر چھوڑنے کے بجائے واپس اپنے گھر ہی لیجاتے.....''

غیاث چچا کا صبر اب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے گرجے۔

''ظفر..... تمہیں شرم آنی چاہیے خود اپنی بیوی کے متعلق ایسی بات کرتے ہوئے..... وہ بے چاری تو.....''

ظفر نے ان کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''بس..... بہت ہو چکا یہ ڈرامہ..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے اس افسر کے ساتھ یہاں آتے اور واپس جاتے دیکھا ہے۔ کیا شریف زادیوں کے یہی لچھن ہوتے ہیں کہ شام ڈھلے دیر تک اندھیرا ہونے کے بعد بھی گاڑیوں میں افسروں کے ساتھ گھومتی پھریں.....؟'' غیاث چچا نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ ظفر پر اٹھنے سے روکا، لیکن اپنی زبان کا کوڑا لہرانے سے خود کو نہ روک سکے۔

''شریف زادیاں ایسا کرنے پر تب مجبور ہو جاتی ہیں جب ان کے میاں گھر میں چارپائی پر پڑ کر بیوی کی کمائی کی روٹیاں توڑنے لگیں..... ایسے میں انہیں خود اپنا اور میاں کا پیٹ پالنے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔''

ظفر کے تن بدن میں غیاث چچا کی یہ بات ایسی آگ لگا گئی کہ وہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھا اور اس کی زبان سے غیاث چچا اور وجو آپی کے لیے مغلظات کا ایک ایسا ریلا بہہ نکلا کہ جس کے آگے بند باندھنے والا کوئی نہ تھا۔ دراصل ظفر کو توقع یہ تھی کہ غیاث چچا وجو آپی کی وجہ سے اس کے سامنے گڑگڑائیں گے، فریاد کریں گے کہ وہ آ کر ان کی بیٹی کو ان کے گھر سے واپس لے جائے اور وہ ان کی بات مان تو لے گا لیکن کچھ نہ کچھ مزید غیاث چچا سے اینٹھنے کے بعد۔ کافی دنوں سے اس کی نظر غیاث چچا کے لمبریٹا (Lumbrita) اسکوٹر پر تھی اور وہ دو تین مرتبہ وجو کے سامنے اس بات کا عذر بھی پیش کر چکا تھا کہ شہر کے فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بندہ گھر سے کام کی تلاش میں نکلے بھی تو کیسے۔ آدھا دن تو بس یا تانگے کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی سواری ہوتی تو کم از کم اُسے لوگوں کے پاس کام مانگنے کے لیے جانے میں تو آسانی ہو جاتی۔

وجو آپی نے اس سے جواباً کہا بھی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ٹیوشن کے پیسوں سے کچھ رقم جوڑ کر قسطوں پر ظفر کے لیے اپنے ابا سے کہہ کر کوئی سواری دلوا دیں گی لیکن ظفر کو بھلا اتنا صبر کہاں سے آتا.....؟

وہ تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اُسے اپنی سواری کی ضرورت کہاں سے پوری کرنی ہے اور وہ کسی بہانے کی تلاش میں تھا کہ جب اسے وجو آپی کے گھر والوں پر دباؤ ڈالنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ آ جائے اور وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کر کے ان سے اپنی بات منوا سکے۔ اور پھر قدرت نے

اُسے وہ موقع فراہم کر ہی دیا اور بدقسمتی سے ڈھو کو ٹیوشن سے واپسی پر دیر ہوگئی۔ جس وقت ریحان صاحب وجو کو لے کر گلی میں داخل ہوئے تھے، تب ظفر وہیں گلی کے نکڑ پر ہی کھڑا چھپ کر یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اُس وقت بھی آگے بڑھ کر تالا کھول کر ڈھو آپی کو گھر میں بلا سکتا تھا لیکن اذیت پسندی کا مارا، یہ شخص ایسے کھیل کھیلنے میں بہت لطف حاصل کرتا تھا اور پھر اُسے تو ویسے بھی ڈھو آپی اور ان کے گھر والوں کی تذلیل کا کوئی نہ کوئی موقع چاہیے ہوتا تھا۔ اور یہاں تو ایک تیر سے دو شکار ہو رہے تھے۔ تذلیل کی تذلیل ہو جاتی اور معاوضے میں اسکوٹر کا مطالبہ بھی دُہرایا جا سکتا تھا۔ لیکن غیاث چچا کی ایک ہی کھری بات نے اُسے انگاروں پر لوٹنے کے لیے مجبور کر دیا۔

ظفر کے شور شرابے سے سامنے کے مکان سے اُس کے ہمسائے کاظمی صاحب بھی باہر نکل آئے اور انہوں نے بھی ظفر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ظفر کا خون تو اُبال کھا رہا تھا۔ ایک مجبور لڑکی کے مجبور باپ کی یہ مجال کہ اُسے طعنے دے..... غیاث چچا بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر کنٹرول کر کے دوبارہ ظفر سے درخواست کی کہ ان کی بیٹی اب ظفر کی بیوی ہے لہٰذا اس کے کردار پر کیچڑ اُچھالنا خود ظفر کی اپنی بے عزتی کے مترادف ہے لیکن ظفر کی شعلے اُگلتی زبان کو اب لگام دینا ناممکن تھا۔ وہ چلا کر بولا۔

''خوب جانتا ہوں میں کہ کس کا کردار کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی لاڈلی کو اب اپنے گھر میں ہی رکھیں۔ میں اس بدنامی کا بوجھ مزید نہیں سہہ سکتا۔ اس گلی محلے میں میری بھی کوئی عزت ہے۔ لیکن جب یہی آس پاس والے اُسے بڑی بڑی گاڑیوں میں صاحب لوگوں کے ساتھ آتے جاتے دیکھیں گے تو میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

غیاث چچا ایک بار پھر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور دھیرے سے بولے۔

''میاں اس کا آسان حل تو یہی ہے کہ تم اپنی بیوی کو گھر میں بیٹھنے کا کہو اور کل سے خود روزگار ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑو۔ نہ وہ گھر سے باہر نکلے گی نہ تمہاری عزت پر کوئی حرف آئے گا۔''

ظفر غرایا۔ ''خوب..... ایک تو چوری..... اوپر سے سینہ زوری..... گویا آپ تمام الزام پھر مجھی کو دے رہے ہیں..... بڑا گھمنڈ ہے نا آپ کو اپنی لائق فائق بیٹی کی کمائی پر، تو پھر ٹھیک ہے۔ رکھیں اپنی اُس کماؤ بیٹی کو اپنے گھر پر۔ نہ مجھے اُس کی ضرورت ہے اور نہ اس کی کمائی کی، میری طرف سے آج سے وہ فارغ ہے۔''

غیاث چچا نے اُس کی زبان روکنے کی کوشش کی اور وہ سراسیمہ ہو کر چلائے۔

''ظفر..... اپنی زبان پر قابو رکھو..... میرا مطلب وہ نہیں جو تم..... لیکن ظفر کی زبان سے جو نکلنا تھا وہ نکل کر ہی رہا.....

''میں نے اسے طلاق دی..... طلاق دی..... طلاق دی.....''

غیاث چچا وہیں کھڑے کھڑے زور سے چکرائے اور زمین پر آ گرے، ظفر نہ جانے کب کا دروازہ بند کر کے اندر جا چکا تھا۔ کاظمی صاحب نے چلا کر آس پاس کے محلے داروں کو اکٹھا کیا اور غیاث چچا کو فوراً رکشہ میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے دل کا دورہ تفتیش کیا اور رات بھر غیاث چچا انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں پڑے رہے۔ سکینہ خالہ اور ڈھو آپی کو گھر پر خبر ملی تو وہ سول ہسپتال دوڑی چلی آئیں۔ صبح کے پچھلے پہر جب

غیاث چچا کو کچھ ہوش آیا تو غنودگی کے عالم میں بھی وہ یہی بڑبڑاتے رہے..... نہیں نہیں..... خدا کے لیے ایسا نہ کرو..... اُسے طلاق نہ دو.....'' تب ساتھ آئے کاظمی صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی سکینہ خالہ اور وجو آپی کو تنہائی میں لے جا کر وہ رُوح فرسا خبر سنا ہی دی جو غیاث چچا کی اس حالت کی ذمہ دار بنی تھی۔ کہتے ہیں انسان کو شدید صدمے کی حالت میں اگر کوئی دوسری اور اس سے بھی بڑی صدمے کی خبر سنائی جائے تو پہلا صدمہ ہی کبھی کبھی دوسرے صدمے کے جھٹکے اور شاک کو برداشت کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ وجو آپی اور سکینہ خالہ پہلے ہی غیاث چچا کی ڈوبتی سانسوں کی وجہ سے اپنے ہوش وحواس گنوا چکے تھے لہٰذا یہ دوسرا بڑا صدمہ انہیں مزید گُم سُم کرنے کا باعث تو بنا لیکن فی الحال انہیں اپنی خبر بھی نہیں تھی لہٰذا ان کے ذہن یہ صدمہ وقتی طور پر تو جھیل گئے کیونکہ وہ پہلے ہی ایک بڑے صدمے سے گزر رہے تھے۔ البتہ اس دوسرے صدمے کے اثرات دیرپا تھے اور یہ غم اور یہ کرب دھیرے دھیرے اور قطرہ قطرہ زہر بن کر ان کی رگوں میں اُترنا ابھی باقی تھا۔

جس وقت راجہ مجھے یہ المناک داستان سنا رہا تھا اُس وقت بھی غیاث چچا دل کے وارڈ میں ہی پڑے ہوئے تھے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر سیدھے ہسپتال ہی چلے گئے۔ وارڈ میں شور شرابے سے بچنے کی غرض سے ایک وقت میں صرف دو فرد ہی مریض کو دیکھنے اندر جا سکتے تھے لہٰذا باقی سب راہداری میں ہی رُک گئے اور میں اور راجہ اندر گئے۔ سکینہ خالہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وجو وہاں نہیں تھیں، شائد گھر گئی ہوں کچھ دیر کے لیے غیاث چچا کو ہوش آ چکا تھا لیکن وہ برسوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے اور چپ چاپ پڑے چھت کو گھورے جا رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ان کا ہاتھ تھام لیا، انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور دھیرے سے دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔ ان کے ہاتھ کی گرفت اور اُس سہارے کے طور پر قبول کیا ہے جو ایسے میں کوئی بھی ٹوٹا ہوا شخص کسی اپنے سے اُمید کر سکتا ہے۔

ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پکی عمر کا ایک باوقار اور سنجیدہ سا شخص ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ لیے اندر داخل ہوا۔ اُس نے بہترین تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر خوبصورت سے ہلکے سنہری فریم کی عینک تھی جو اس کے وجیہہ چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ راجہ نے آہستہ سے میرے کان میں بتایا کہ یہی ریحان صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ سٹاف نرس بھی غیاث چچا کے پردوں سے الگ کر کے بنائے گئے کیبن میں داخل ہوئی۔ کیبن میں اتنے لوگوں کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا میں اور راجہ اٹھ کر باہر آ گئے۔ باہر راہداری میں ریحان صاحب کا باوردی ڈرائیور بھی ایک جانب کھڑا نظر آیا اور راجہ سے انتہائی پُرتپاک طریقے سے ملا۔ راجہ نے بتایا کہ گزشتہ تین چار دن سے ریحان صاحب کا ڈرائیور روزانہ انہیں وجو آپی کے گھر اور ہسپتال لاتا رہا ہے لہٰذا محلے میں اور پھر یہاں ہسپتال میں روزانہ ہی راجہ سے ملاقات کی وجہ سے دونوں میں اچھی خاصی جان پہچان ہو چکی ہے۔ بالے اور نھو وغیرہ بھی راہداری میں پڑے بینچوں پر ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ چند لمحے میں غور سے اپنے بچپن کے ان ساتھیوں کو دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کیوں اچانک ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اپنے بچپن کے چلے جانے کا احساس۔ وہ سب بھی اب نوجوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔ باقاعدہ شیو بنانے لگے تھے اور ان کے جسم بھی میرے جسم کی طرح سخت اور ٹھوس سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ ہاں..... اگر کچھ نہیں بدلی تھی تو وہ تھی ان کے چہروں کی معصومیت..... شاید ہماری عمر کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے اور ہم کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں لیکن اپنے والدین کے لیے اور اپنے بچپن کے دوستوں کے لیے ہم ہمیشہ عمر کے اُسی حصے میں رہتے ہیں، جسے بچپن کہتے ہیں۔ ایسے رشتوں

کے درمیان بچپن کا یہ دسمبر کبھی ختم نہیں ہوتا..... جوانی کی دھوپ کے مصائب انہیں کبھی چھو بھی نہیں پاتے۔

غیاث چچا کو مزید ایک ہفتہ وہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا اور پھر بہت سی احتیاطیں بتا کر انہیں اگلے ہفتے ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ گھر واپس آ گئے لیکن ان کی زبان کو لگی چپ نہ ٹوٹ سکی۔ سکینہ خالہ اور وجو نے اس بات کا خاص دھیان رکھا کہ وہ ان کے سامنے ایسی کوئی بات یا اپنی اُداسی اور دُکھ کا اظہار نہ کریں جو غیاث چچا کو مزید دکھی کرنے کا سبب بن سکے۔ لیکن کیا ان کے اس طرح چھپانے سے ان دونوں کا دکھ غیاث چچا سے چھپ سکتا تھا.....؟

اُن کی بیٹی دو سال بعد ہی طلاق کا ٹیکہ لگا کر گھر واپس آ بیٹھی تھی اور اس سب کا ذمے دار وہ کہیں نہ کہیں خود اپنے آپ کو ہی سمجھتے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں ہر وقت بس ایک اسی ''کاش'' کی گردان ہوتی رہتی کہ کاش وہ اس رات ظفر کے سامنے نہ بولتے، کاش وہ اپنی تلخی پر قابو پا لیتے، کاش وہ چند لمحے مزید خون کے گھونٹ پیتے رہتے اور ظفر کو اس کی شرطوں پر گھر منا لاتے، کاش وہ اس کم ظرف انسان کو خود اُسی کے سامنے، آئینہ دکھا کر کھڑا نہ کر دیتے..... کاش..... کاش..... کاش لیکن یہ کاش کی گردان اب سوائے اُن کے خون کے فشار کو بڑھانے کے، مزید اور کچھ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔

بہت دن تک میں خود بھی وجو سے، جانے کیوں نظر ملا نہیں پایا۔ جب کبھی وہ ہسپتال میں یا پھر بعد میں، اپنے گھر میں میرے سامنے آ جاتیں تو میں نظریں جھکا لیتا تھا۔ شاید میرے اندر کہیں نہ کہیں یہ شرمندگی بھی پل رہی تھی کہ میں کبھی ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی ہمیشہ ہی سے جانے کتنے طوفانوں کا سامنا اکیلے ہی کرتی آئی تھی۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی.....؟ مجھ سے صرف سات آٹھ برس ہی تو بڑی تھیں وہ..... میں جب کبھی عمر کے اس فرق کو ہٹا کر یا پھر انہیں اپنی جگہ رکھ کر سات برس کا یہ میزان کرتا تو حوصلے، صبر اور طاقت میں میں انہیں اپنے آپ سے کہیں آگے پاتا تھا۔ یا پھر شاید کسی کا یہ کہا بھی ٹھیک ہی تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ کم از کم وجو آپی کی حد تک تو یہ بات بالکل اور سو فیصد درست تھی۔ پہلے اُگو کا معاملہ، پھر طاہر بھائی کی موت، پھر پڑھائی ادھوری رہ جانا، پھر اس کم ظرف سے شادی اور اب یہ طلاق..... کیا کچھ نہیں سہا تھا انہوں نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں.....

اُس دن بھی میں ان کے صحن میں پڑی آرام کرسی پر بیٹھا انہیں دیکھتے ہوئے یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں غیاث چچا کو ٹہلانے کے لیے باہر لے کر گیا تھا اور چند لمحے پہلے ہماری واپسی ہوئی تو انہوں نے وجو سے قہوہ پینے کی فرمائش کی تھی۔ وجو سامنے باورچی خانے میں سے قہوے کی پیالیاں ٹرے میں اٹھائے میری طرف ہی آ رہی تھیں، غیاث چچا شاید کچھ لمحے ستانے کے لیے اپنے کمرے میں گئے تھے۔ وجو اب بہت کم بولتی تھیں یا پھر بالکل ہی خاموش رہتی تھیں۔ ہم دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی شام کو غیاث چچا کو کچھ دور تک ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ٹہلانے کے لیے لے جاتا تھا۔ ریحان صاحب نے بھی اس موقعے پر اپنا بڑا پن دکھایا تھا اور وہ بھی تقریباً ہر دوسرے روز غیاث چچا کو دیکھنے کے لیے آ جاتے تھے، وجو سے انہوں نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بچے اب کسی بھی دوسری ٹیچر سے ٹیوشن لینے کے لیے تیار نہیں ہیں لہٰذا چاہے مہینہ بھر کے بعد ہی کیوں نہ سہی، وہ وجو ہی سے دوبارہ ٹیوشن جاری رکھنے کی استدعا کریں گے۔ مجھے اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوئے مہینہ ہونے کو آیا تھا اور دو چار دن

میں میرا رزلٹ بھی نکلنے والا تھا۔ اتنے بہت سے دنوں میں اگر وجو نے مجھ سے کوئی بات کی تھی تو یہی کہ میرے پرچے کیسے ہوئے ہیں؟ اور میرا رزلٹ کب تک آئے گا؟ یا یہ کہ اب آگے میرا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ وہ جانتی تھیں کہ مجھ سے ڈسپلن اور نظم وضبط کچھ کم ہی برداشت ہوتا ہے لہٰذا میں فوج تو قطعی جوائن نہیں کروں گا۔ اس لیے انہیں میرے مستقبل کے شعبے کی ہمیشہ ہی فکر لگی رہتی تھی۔ خود میرے ذہن میں بھی ابھی تک اس بارے میں کوئی حتمی خاکہ تشکیل نہیں پا سکا تھا۔

اس دن بھی وجو نے بیٹھتے ہی مجھ سے یہی سوال کیا کہ اب تو رزلٹ بھی ہفتے بھر میں آ ہی جائے گا تو اب تک میں کوئی حتمی فیصلہ کیوں نہیں کر سکا؟ میں ابھی انہیں جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر اچانک دستک نے میری توجہ بٹا دی، میں اٹھ کر دروازہ کھولنے کے لیے چلا گیا۔ وجو اندر برآمدے کو ڈھانکتی جافری کی اوٹ میں چلی گئیں۔ باہر ریحان صاحب کھڑے تھے لیکن ان سے کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر میرے سارے جسم کا خون لمحہ بھر میں میری کن پٹیوں کی جانب سمٹ آیا اور میرے چہرے پر نفرت کے کچھ ایسے آثار پیدا ہوئے کہ لمحہ بھر کو ریحان صاحب بھی سٹپٹا سے گئے۔ وہ ظفر تھا، ہاں..... وہ ظفر ہی تو تھا۔ میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ وجو کی رخصتی کے موقع پر دو سال پہلے اُسے دیکھا تھا لیکن میں اس کی صورت کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ریحان صاحب صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ گئے اور انہوں نے آہستہ سے کھنکار کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ میرا نام جانتے تھے۔

''عباد میاں..... ہو سکے تو اندر کسی طرح وجیہہ کی امی کو خبر کروا دیجیے کہ ظفر ان سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن دھیان رہے کہ غیاث صاحب کو اس کی خبر نہ ہو۔ میں اسے یہاں کبھی لے کر نہ آتا لیکن یہ میرے گھر پر آ کر بہت گڑگڑایا اور بہت معافی مانگی ہے اس نے اپنی غلطی اور اپنے بُرے سلوک کی، اسی لیے یہ اپنی غلطی کے ازالے کی خاطر وجیہہ اور ان کی امی سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں نے حیرت سے ریحان صاحب کی طرف دیکھا۔ دیکھنے میں تو اچھے خاصے عقل والے اور سمجھ دار لگتے تھے۔ پھر آج وہ کس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ظفر نے وجو کو آخر کار طلاق ہی دے دی تھی تو پھر اب بھلا کیسا ازالہ اور کون سا مرہم؟؟..... اب تو قصہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ شاید ریحان صاحب نے بھی میری آنکھوں میں سے جھانکتی حیرت اور چہرے پہ لکھے سوالوں کو پڑھ لیا تھا، تبھی انہوں نے یہ عقدہ کھولا کہ اس رات ظفر سے غصے کے عالم میں جو کچھ بھی ہوا، صبح تک اپنی اُس غلطی پر وہ بے حد نادم ہو چکا تھا۔ ویسے بھی اس نے غیاث چچا کو بقول اس کے، جو بھی کہا تھا، وہ غصے میں کہا تھا اور غصہ تو ہے ہی ایسی لعنت کہ انسان کو حیوان بنانے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ دوڑا ہوا اپنی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا اور ان سے گول مول سا ذکر کیا کہ اُس نے اپنے سُسر کے سامنے اپنی بیوی کو فارغ کیے جانے کے الفاظ غصے میں کہہ دیے ہیں لہٰذا وہ بتائیں کہ اس کا کیا حل ہے۔ پیش امام صاحب نے اس سے کہا کہ طلاق تو دی ہی غصے کی حالت میں جاتی ہے، لہٰذا اگر اس نے اپنی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ کہا ہے تو طلاق واقع ہو چکی۔ ہاں البتہ اس نے غصے میں صرف ایک مرتبہ کہا ہے کہ وہ میری جانب سے فارغ ہے اور نیت اس کی تب بھی طلاق ہی کی تھی تو پھر تین طلاقوں میں سے ایک طلاق تو ہو گئی لیکن اب بھی وہ اپنی بیوی کو گھر لا سکتا ہے۔ لیکن یہ دھیان میں رہے کہ اب اس کے پاس صرف دو طلاق ہی کی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ لہٰذا ظفر کا دعویٰ اب یہ تھا کہ اس نے وجو کو صرف ایک ہی طلاق دی تھی اور وہ بھی لفظ طلاق سے نہیں..... بلکہ اس جملے

سے کہ ''اب وہ میری طرف سے فارغ ہے.....''

ریحان صاحب صاف دل انسان تھے، انہوں نے ظفر کی یہ فریاد سنی اور اسے بظاہر اپنے کیے پر شرمندہ دیکھا تو وہ اسے یہاں لے آئے تھے۔ ظفر اسی طرح دُور سر جھکائے اور مسکین سا بنا کھڑا تھا۔ مجھے ظفر کی کسی بات کا رتی بھر بھی بھروسہ نہیں تھا لیکن چونکہ ریحان صاحب خود کافی دیر سے دروازے پر کھڑے تھے لہٰذا میں نے کسی طور اندر یہ اطلاع پہنچا دی کہ ریحان صاحب کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے فی الحال غیاث چچا کی موجودگی، ان کی ابتر صحت کی وجہ سے کچھ مناسب نہیں ہوگی۔ میں نے جان بوجھ کر سکینہ خالہ کو ظفر کی باہر موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ خود بھی سوچ میں پڑ گئیں کہ اس وقت غیاث چچا کی موجودگی میں بھلا وہ کیونکر اور کیسے ریحان صاحب کی بات سن سکتی تھیں، میں نے انہیں تجویز دی کہ میں جا کر راجہ لوگوں کی بیٹھک کھلوا دیتا ہوں وہ چاہیں تو وہاں جا کر بات کر لیں کیونکہ اگر وہ اتنی دیر دروازے پر کھڑی ہو کر بھی ریحان صاحب کی بات سنیں گی تو غیاث چچا کو شک تو ضرور ہو جائے گا۔ ہم ابھی اسی کش مکش میں تھے کہ قدرت نے ہمارا مسئلہ خود حل کر دیا۔ ڈجو نے غیاث چچا کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور دھیرے سے آ کر ہمیں آہستہ بات کرنے کا کہا کیونکہ غیاث چچا کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ڈجو کو ابھی تک اس سارے ماجرے کا یکسر پتہ نہ تھا۔ سکینہ خالہ نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں یہیں ان کے مہمانوں کے کمرے میں لے آؤں۔ باہر آ کر میں نے ریحان صاحب سے کہا کہ انہیں سکینہ خالہ نے اندر آنے کا کہا ہے لیکن فی الحال وہ اکیلے ہی بات کر آئیں تو بہتر ہوگا۔ ریحان صاحب میرا اشارہ سمجھ گئے اور انہوں نے ظفر کو ان کی گاڑی میں ہی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا اور خود اندر چلے گئے۔ میں وہیں دروازے پر جما کھڑا رہا کیونکہ مجھے ظفر سے کوئی اچھی اُمید بالکل بھی نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب واپس باہر آ گئے اور میں نے ان کے چہرے پر لکھی تحریر سے ہی نتیجہ اخذ کر لیا کہ سکینہ خالہ نے اُن سے کیا کہا ہوگا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر پلٹ گئے، چند قدم دُور جا کر انہیں نہ جانے کیا خیال آیا کہ واپس میری جانب پلٹ آئے۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا، وہ قریب آ کر بولے۔

''عباد میاں..... میں نہیں جانتا کہ یہ شخص سچ بول رہا ہے یا جھوٹ، کیونکہ اس واقعے کے عینی گواہ خود غیاث صاحب ہیں اور وہی بہتر جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے لیکن اس وقت ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم ان سے بھی یہ حقیقت جان نہیں سکتے..... میں اسے یہاں صرف اس خیال سے لے کر آیا تھا کہ اگر کسی بھی طرح میری کسی بھی کوشش سے اس دُکھی گھرانے اور اس مظلوم لڑکی کے غموں کا کچھ مداوا ہو سکے، تو کر گزروں..... لیکن وجیہہ کی امی بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ یہ وقت اس سارے قصے کو چھیڑنے کا ہے ہی نہیں..... ابھی بمشکل غیاث صاحب کی ذرا سی طبیعت سنبھلی ہے۔ ان کے سامنے اس وقت ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جو انہیں ذہنی یا دلی اذیت دینے کا باعث بن سکتی ہو۔ میں اس شخص کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ فی الحال چند ہفتے اس بات کو بھول ہی جائے تو بہتر ہے۔ لیکن جانے اسے میری بات سمجھ بھی آئے یا نہیں.....؟ لہٰذا اب تم کو یہاں بہت ہوشیار اور بیدار رہنا ہوگا تاکہ یہ موقع پا کر کوئی نیا فتنہ کھڑا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے.....''

میں نے ریحان صاحب کی بات توجہ سے سنی اور انہیں اطمینان دلایا کہ وہ بے فکر ہو کر جائیں۔ سکینہ خالہ کی مرضی کے بغیر ظفر ان کے

دروازے پر تو کیا اس محلے کے آس پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔ ریحان صاحب میرا کندھا تھپتھپا کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے جہاں ظفر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ریحان صاحب نے اس سے کچھ بات کی لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اُن کی بات سے پوری طرح متفق نہیں ہے لیکن ریحان صاحب نے پھر بھی ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

دراصل ظفر کو اُسی رات اپنی اس گھناؤنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس میں بھی اس کی طرف سے کسی نیک نیتی کا عمل دخل نہیں تھا، نہ ہی اسے اپنے کیے پر کوئی پشیمانی تھی۔ اُسے تو صرف ایک بات کی ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس نے وقتی جوش اور غصے میں آ کر ذوی کو طلاق تو دے دی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ختم کر بیٹھا تھا اور پھر ایک اچھی خاصی گھر کی نوکرانی سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے، نوکرانی بھی کیسی؟ جو صبح سے لے کر رات تک نہ صرف اس کے گھر کے کام کاج اور بنانے سنوارنے میں جُتی رہتی تھی بلکہ شام کو دوسروں کے گھر جا کر ان کے بچے پڑھا کر اتنی کمائی بھی کر لاتی تھی، جس سے ظفر کے پیٹ کا غار بھر جائے..... لہٰذا اگلے ایک ہفتے میں ہی ظفر کو اپنی حماقت کا شدید احساس ہونا شروع ہو گیا۔ پچھلے دو سالوں میں تو اُس نے اٹھ کر ایک گلاس پانی تک خود نہیں پیا تھا۔ اب جو گھر کے مختلف کام اور کھانے پینے کی مجبوری نے اس کے سامنے منہ کھولا اور اسے اپنی عیاشی اور جوئے کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو اُسے ذوی بُری طرح یاد آئیں۔ اس کا شاطر ذہن پہلے دس بارہ دن تو مختلف قسم کے منصوبے بناتا اور انہیں رد کرتا رہا، لیکن پھر جب اُسے کسی دوست نے کسی عالم سے مشورہ کرنے کی صلح دی اور وہ محلے کی مسجد کے امام کے پاس زندگی میں پہلی مرتبہ، اپنی اس مجبوری کی وجہ سے مسجد کی سرحد پار کر گیا تب مولوی صاحب کی باتوں نے اُسے یہ راستہ سُجھا دیا کہ وہ مکمل طلاق دینے سے ہی یکسر انکار کر دے گا۔ دوسرا منصوبہ اُس نے یہ بنایا کہ براہِ راست غیاث چچا کے گھر جانے کے بجائے وہ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بڑے افسر تھے اور ذوی کے خیر خواہوں میں سے ایک تھے، اور ذوی کی عزت بھی بہت کرتے تھے۔ انہیں ہمیشہ ذوی جیسی احساسات کی پڑھی لکھی لڑکی کا ایسے جنگلی اور اُجڈ شخص سے رشتہ ہونے پر بھی دل ہی دل میں بہت افسوس ہوتا تھا لیکن ظاہر ہے یہ قدرت کے کھیل تھے اور اس میں بھلا ریحان صاحب کیا کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ ظفر کی باتوں پر اعتبار کر بیٹھے تھے، صرف اس لیے کہ اگر ظفر سچ بول رہا ہو گا تو ذوی کا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ دراصل وہ خود کو بھی ذوی کے ساتھ ہوئے اس ظلم کا کہیں نہ کہیں ذمہ دار ٹھہراتے تھے نہ اس شام اُن کا ڈرائیور ذوی کو چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر جاتا، نہ ذوی لیٹ ہوتیں اور نہ ہی انہیں آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔ ڈرائیور کو تو انہوں نے اگلے دن ہی نوکری سے فارغ کر دیا تھا لیکن وہ بے چارہ روتا دھوتا کچھ دن بعد ذوی کے گھر آن پہنچا کہ اُس سے جو بھی غلطی ہوئی انجانے میں ہوئی اور اس کی بے روزگاری سے بچے گھر میں فاقوں پر مجبور ہیں۔ لہٰذا ذوی نے خود ہی ریحان صاحب سے کہہ کر اُسے دوبارہ نوکری پر لگوا دیا تھا۔ وہ بے چارہ اس بات پر ذوی کا اس قدر احسان مند تھا کہ اٹھتے بیٹھتے انہیں دعائیں دیتا رہتا تھا، لیکن شاید اُسے بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کچھ لوگوں پر قدرت دعاؤں کے دَر بھی بند کر دیتی ہے۔ شاید وہ بدقسمت بہت خاص لوگ ہوتے ہوں گے کہ جن کے لیے اتنا کڑا نصیب لکھ کر انہیں زمین پر بھیجا جاتا ہو گا۔

ذوی بھی انہی میں سے ایک تھیں کہ جن کے مقدر کی کنجیاں قدرت تالا لگا کر نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی تھی؟ ظفر نے دو چار دن تو ریحان صاحب یا ذوی کے گھر والوں کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیا اور پھر کوئی پیش رفت ہوتی نہ دیکھ کر اس نے پھر غیاث چچا کے گھر کا رُخ کیا، لیکن اس بار وہ اکیلا تھا۔ میں پہلے ہی راجہ اور بالے کو بتا چکا تھا کہ اب ہمیں چوبیس گھنٹے اس بات کا دھیان رکھنا ہو گا کہ ظفر کسی بھی طرح غیاث چچا کے گھر

تک نہ پہنچ پائے، ہم میں سے کوئی نہ کوئی وہاں آس پاس موجود ہی رہتا تھا لیکن یہ ظفر کی بدقسمتی تھی کہ جس شام وہ ہمارے محلے میں گھسا، اس وقت ہم سارے ہی دوست بڑے میدان میں موجود تھے۔

راجہ نے مجھے کہنی مار کر ظفر کی جانب متوجہ کیا جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے ''گزشتہ سسرال'' کی جانب جا رہا تھا۔ بالے نے سیٹی بجا کر اُسے آواز دی۔

''میں نے کہا ظفر بابو..... جاتے کہاں ہو..... دو گھڑی ہماری بات تو سُن لو۔''

ظفر ہم لوگوں کو وہاں دیکھ کر کچھ ٹھٹکا، مجھے تو وہ پہلے بھی وجو کے دروازے پر اس دن دیکھ ہی چکا تھا لہٰذا اُسے ہمارا مقصد سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی۔ ہم نے آگے بڑھ کر ظفر کے گرد یوں گھیرا بنا لیا کہ اس کے آگے بڑھنے کا راستہ ہی بند ہو گیا۔ لیکن وہ بھی اپنی ذات کا ایک ہی کائیاں شخص تھا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور اکڑ کر بولا ''تم لوگ یوں میرا راستہ نہیں روک سکتے..... مجھے غیاث چچا سے ملنا ہے۔ میں اپنی بیوی کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

میں نے بہت مشکل سے اُسے تمیز سے جواب دیا۔

''غیاث چچا کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ کچھ دن بعد تشریف لائیں۔''

ظفر کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔

''نہیں..... میں مزید انتظار نہیں کر سکتا..... اور خبردار جو تم میں سے کسی نے بھی میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو..... تم لوگ ابھی ظفر سے واقف نہیں ہو۔''

ظفر نے قدم آگے بڑھائے۔ ہم سب پیچھے ہٹ گئے۔ ظفر نے اسے اپنی فتح جانتے ہوئے فخر سے سر اونچا کیا لیکن دوسرے ہی لمحے بالے کی اڑائی ہوئی ٹانگ کے جھٹکے سے وہ زمین بوس ہوتے ہوتے بچا۔ ظفر غرا کر ہماری جانب پلٹا، اب راجہ اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ راجہ نے ظفر کی کلائی پکڑ لی اور جھٹکا دے کر بولا۔

''یہ مت سمجھنا کہ یہ باقی سارے تم سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ دراصل ہم نہیں چاہتے کہ تم اس محلے سے باہر جا کر لوگوں سے یہ کہتے پھرو کہ یہاں تمہارے ایک کے مقابلے میں پانچ پانچ آ گئے تھے لہٰذا تم کچھ کر نہ پائے۔ تمہارے لیے صرف میں ہی کافی ہوں..... بولو کیا ارادہ ہے پیارے.....؟''

ظفر نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے دو چار بار زور لگایا لیکن میں راجہ کی گرفت کو بہت اچھی طرح جانتا تھا، بچپن میں جب ہم زور کا مقابلہ کرتے تو راجہ کی پکڑ کو ہم تین تین مل کر بھی نہیں کھول پاتے تھے۔ کچھ ہی لمحوں میں ظفر بھی پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہم سب کو کسی طرح کچا ہی چبا جائے۔ اس نے آخری حربہ آزمایا۔

''ٹھیک ہے..... تو تم لوگ اس غنڈہ گردی سے باز نہیں آؤ گے۔ میں ابھی واپس جا کر پولیس کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ پھر دیکھنا پولیس تم لوگوں کا کیا حشر کرتی ہے۔''

بالے نے اُس کی بات سنی تو زور سے ہنس کر بولا۔

''یہ تکلیف کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے ظفر بابو..... پولیس کو ہم خود بلا لیتے ہیں۔ سُنا ہے اپنا پرانا علاقہ تھانیدار ملک ریشم ترقی پا کر ڈی۔ ایس۔ پی ہو گیا ہے اور آج کل اس کی ڈیوٹی بھی دوبارہ یہیں ہمارے علاقے میں لگا دی گئی ہے۔ بڑا ظالم افسر ہے۔ جھوٹے کو تو قبر تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے..... ابے او نتھو..... جا جا کر ملک صاحب کو یہیں بلا کر لے آ..... تب تک ہم ظفر بابو کی یہیں خاطر مدارات کرتے ہیں۔''

نتھو نے جلدی سے دانت نکالے اور ظفر کی جانب دیکھ کر بولا۔

''قسم خدا کی..... بلا لاؤں کیا.....؟؟''

ظفر کو اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہماری موجودگی میں اس کا مقصد حل ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں لہٰذا وہ پلٹ کر بکتے جھکتے ہوئے محلے سے واپس چلا گیا۔ میں نے احتیاطاً اسی وقت محلے کے باہر بنے پی۔ سی۔ او سے ریحان صاحب کے نمبر پر انہیں فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا انہوں نے مجھے تسلی دی کہ ہمارے علاقے کا ایس۔ پی ان کا کورس میٹ ہے لہٰذا ایس۔ ایچ۔ او یا کوئی بھی دوسرا پولیس افسر ظفر کی کسی بھی شکایت پر ایس۔ پی کو اطلاع کیے بنا نہ تو کوئی کاغذی کارروائی کرے گا اور نہ ہی ظفر کے ساتھ کہیں جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ ظفر ٹک کر بیٹھنے والی ہڈی نہیں ہے لہٰذا ہم لوگوں نے ڈھو کے گھر کے گرد پہرہ مزید سخت کر دیا۔ ظفر نے ایک آدھ بار اور کوشش کی لیکن محلے کے باہر سے ہی ہمیں دیکھ کر اُلٹے پیروں واپس لوٹ گیا۔ ہم نے رات والے محلے کے چوکیدار کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ باہر کا پھاٹک بند ہونے کے بعد کسی بھی باہر کے آدمی کو اندر داخل ہونے نہ دے، اور اگر کوئی اُسے مجبور کرے بھی تو ہم دوستوں میں سے کسی بھی ایک کو آ کر اس بات کی اطلاع دے دے۔ لیکن ظفر نے رات کے اندھیرے میں محلے میں گھسنے کی جرأت نہیں کی۔ شاید اسے اس شام ہماری آنکھوں میں چھپے غصے سے ہمارے ارادوں کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم رات کی تنہائی میں اسے اپنے سامنے پا کر اس کی کیا گت بنا سکتے ہیں۔

لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود میرے اندر کوئی چیز ایسی تھی، جو ہر لمحہ مجھے بے چین کیے رکھتی تھی۔ اور پھر مجھے میری بے چینی کا جواب بھی مل ہی گیا۔ تیسرے ہفتے کے آخر کی بات ہے، ڈاکیہ ایک رجسٹری لے کر محلے میں داخل ہوا اور اُس نے سیدھے جا کر غیاث چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فضلو بابا نے رجسٹری وصول کر کے دستخط کر دیئے۔ اور چند لمحوں بعد ہی میرے اندر کی بے چینی اور واہموں نے باہر نکل کر حقیقت کا رُخ اختیار کر لیا۔ ظفر نے عدالت میں دعویٰ کر دیا تھا کہ اس کی بیوی کو اس کی مرضی کے بغیر اس کے گھر والوں نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے لہٰذا اس نے عدالت سے شنوائی کی درخواست کی تھی۔ ڈھو آپی کے خاندان پر ایک اور دُکھ اور مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا پہلے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ غیاث چچا کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے۔ ڈھو آپی نے مجھے ریحان صاحب سے بات کرنے کا کہا۔ ریحان صاحب نے کہیں سے کہلوا کر ایک وکیلنی کا انتظام کروا دیا جو ایسے معاملات میں مہارت کی شہرت رکھتی تھی۔ وہ گھر پر سکینہ خالہ کی دور کی جان پہچان والی بن کر آتی رہی اور معلومات حاصل کر کے کیس آگے بڑھاتی رہی۔ ایک بار ڈھو کا بیان بھی عدالت میں ہوا اور انہوں نے کھل کر جج کو بتا دیا کہ وہ کسی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ خود اپنے گھر میں اور اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں۔ کیونکہ درخواست گزار اب ان کا شوہر نہیں رہا اور انہیں طلاق دے چکا ہے۔ کیس نے اپنا رُخ پلٹ لیا اور اب اس بات کا فیصلہ ہونا باقی رہ گیا کہ آیا طلاق ہوئی بھی ہے یا نہیں.....؟ اور ایسے موڑ پر غیاث چچا کی گواہی لازمی ہو گئی تھی لہٰذا اس موقع پر بھی ریحان صاحب نے ہی یہ

معرکہ سرانجام دینے کا فیصلہ کیا اور ایک شام اپنی موٹر خود چلاتے ہوئے غیاث چچا کے گھر آئے اور انہیں قریبی پارک تک گھمانے کے بہانے اپنی گاڑی میں بٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے۔ غیاث چچا جب تین گھنٹے بعد گھر واپس لوٹے اور ریحان صاحب کی گاڑی سے اترے تو ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو وجو صحن میں ہی بیٹھیں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے کھوئی کھوئی نظروں سے وجو کو دیکھتے رہے، وجو ان کے اس طرح دیکھنے سے کچھ گھبرا سی گئیں، اور جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئیں۔

''ابا..... کیا ہوا.....؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا.....؟؟''

غیاث چچا کی داہنی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ ان کی لاڈلی آج بھی اپنے سارے دُکھ بھلا کر صرف انہی کی وجہ سے پریشان تھی..... انہی کی تکلیف کا مداوا چاہتی تھی، انہوں نے وجو کے سر پہ ہاتھ رکھا اور پھر جیسے ضبط کے سارے دامن چھوٹ گئے۔ وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ سارا جل تھل ہو گیا۔ وجو کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں، وہ باپ کے گلے سے یوں لگیں کہ اب دوبارہ کبھی علیحدہ نہیں ہوں گی، سکینہ خالہ اندر سے ہڑبڑائی ہوئی بھاگی آئیں اور باپ بیٹی کو یوں گلے ملے روتے دیکھ کر بنا کچھ پوچھے ہی رو پڑیں۔ ویسے بھی اس بدقسمت خاندان کے پاس رونے کی وجوہات کی کبھی کمی نہیں رہی تھی۔

لیکن یہ آنسو بھی کتنی عجیب چیز ہوتے ہیں، کھل کر بہہ جائیں تو کم از کم وقتی طور پر ہی سہی، لیکن دل کا بوجھ کچھ نہ کچھ ہلکا ضرور کر دیتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیسی کمال کی تاثیر ہوتی ہے اس بے ضرر سے مائع کے اندر.....؟

ریحان صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے انداز سے غیاث چچا کو دھیرے دھیرے ظفر کے نوٹس کی تمام تفصیلات بتا دی تھیں۔ دنیا میں ہر بات اور ہر راز کھولنے کا ایک سلیقہ ضرور ہوتا ہے، ایک ایسا سلیقہ جو کڑوے سے کڑوے سچ کو بھی گھونٹ گھونٹ پینے پر مجبور کر دیتا ہے اور انسان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کیسا کڑوا زہر اپنے اندر اتار چکا ہے۔ ریحان صاحب اس سلیقے سے بخوبی واقف دکھائی دیتے تھے، انہوں نے غیاث چچا کو پورا سچ بتا دیا تو ضرور، لیکن کچھ ایسے انداز سے کہ اس سچ کی کڑواہٹ نے ان کے پہلے سے زخمی اور بیمار دل کو وہ جھٹکا نہیں دیا جو کسی اور صورت انہیں یہ بات پتہ چلنے کی صورت میں لگ سکتا تھا۔

کہتے ہیں تمہید بات کا اثر بڑھا بھی سکتی ہے اور ایسی ہی کوئی لمبی تمہید اپنی بات کا اثر زائل بھی کر سکتی ہے۔ لہٰذا ریحان صاحب نے لمبی تمہید تو باندھی لیکن اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے..... بہرحال اب غیاث چچا کو بھی آنے والے دنوں کی مشکلات کے بارے میں اعتماد میں لیا جا چکا تھا۔ غیاث چچا نے ریحان صاحب کو بتا دیا تھا کہ انہوں نے خود اپنے کانوں سے ظفر کی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ سنا تھا اور انہیں اس بات میں ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ لہٰذا صاف ظاہر تھا کہ ظفر جھوٹ بول رہا ہے ورنہ کوئی بھی باپ خود اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کا گھر کیوں توڑنا چاہے گا؟..... وہ تو خود ظفر کو یہ کہنے کے لیے گئے تھے کہ وہ ان کے گھر آ کر اپنی امانت کو واپس لے جائے۔ لیکن اس کم بخت نے وہیں دروازے پر ہی یہ کفر کر ڈالا، تبھی تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ خود ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

ریحان صاحب کو تو ظفر کا سچ پتہ چل چکا تھا لیکن ابھی یہ سچ عدالت کو پتہ چلنا باقی تھا اور ہم سب ہی جانتے تھے کہ یہ بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ اگلی ہی پیشی پر غیاث چچا کو بھی عدالت میں حاضری دینی پڑی اور انہوں نے اس رات جو بھی بیتی تھی، حرف بہ حرف عدالت کے سامنے بیان کر دی۔ لیکن

ظفر بھری عدالت میں اس بات سے مکر گیا اور اس نے فوراً اپنی جیب سے کسی مولوی کا دیا ہوا فتویٰ بھی عدالت کے رُوبرو رکھ دیا کہ ایک طلاق دینے سے مکمل طلاق واقع نہیں ہوتی اور چونکہ اس نے ایک طلاق ہی دی تھی لہٰذا اس کا اپنی بیوی سے تعلق اب بھی برقرار تھا اس لیے اُس نے عدالت سے استدعا کی کہ قانون اور مذہب کی رُو سے اسے اپنی بیوی کو گھر لیجانے کی اجازت دی جائے۔ غیاث چچا کے تین طلاق کے دعوے کو اس نے یکسر یہ کہہ کر جھوٹ قرار دے دیا کہ چونکہ اس کا سُسر اس رشتے سے خوش نہیں تھا لہٰذا اس رات وہ ظفر کو یہی دھمکانے آیا تھا کہ اگر ظفر نے اس کی بیٹی کو طلاق نہیں دی تو وہ ظفر کا نام ونشان تک اس دنیا سے مٹا دے گا لہٰذا ظفر نے ڈر کر ایک طلاق تو دے دی تھی لیکن اس نے منہ سے تین طلاق کا لفظ نہیں نکالا تھا۔

کیس پیچیدہ ہو گیا تھا۔ کیس کا واحد عینی گواہ خود لڑکی کا باپ تھا اور مدعی نے پہلے ہی لڑکی کے باپ پر اپنے شک وشبے کا اظہار کر دیا تھا لہٰذا عدالت بھی سوچ میں پڑ گئی اور اُس نے مختلف مذہبی علماء سے مشورے تک اگلی تاریخ دے دی اور اس دن کیس مؤخر ہو گیا۔

اگلی پیشی تک ہم سب پھر سے اُسی سولی پر ٹنگ چکے تھے، جو ہمارے مقدروں نے جانے کیوں جیون کی ہر راہ پر اور ہر نئے آنے والے موڑ پر ہم سب کے لیے ٹانگ رکھی تھی۔ اگلی پیشی پر عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہر طرف نظروں کی برچھیاں تھیں جو اس مدرخ کی موم جلد میں گڑی جاتی تھیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں تھیں جو اس پری رُو کی کومل سماعتوں کو چھیل رہی تھیں۔ عدالت نے قاضی صاحب کو بھی معاونت کے لیے طلب کیا ہوا تھا۔ ظفر بے حد مطمئن دکھائی دیتا تھا کیونکہ اس نے اپنے تئیں عدالت کو شک میں ڈال کر آدھی جنگ تو جیت ہی لی تھی۔ اب اس کا مقصد حل ہوتے نظر آ رہا تھا۔ وہ اس معاملے کو اسی طرح کھینچتے رہنا چاہتا تھا تاکہ بجو اور ان کے سارے خاندان کی ہمت کچھ اس طرح ٹوٹے کہ وہ سب اُس کے قدموں میں آ گریں۔ کیس کی شنوائی شروع ہوئی تو ظفر کے وکیل نے پھر وہی اعتراض کیا کہ مقدمے کا واحد اور عینی گواہ جس کا دعویٰ ہے کہ ظفر نے زبان سے تین طلاق کہا تھا، دراصل خود بیٹی کا رشتہ توڑنا چاہتا ہے لہٰذا اس کی گواہی معتبر نہیں مانی جا سکتی، نہ ہی اس کے حلفیہ بیان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اور لڑکی بھی اپنے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے ورنہ دل سے وہ اب بھی اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے۔ عدالت نے ہماری وکیلنی سے پوچھا کہ کیا اس وقوعے کے بارے میں مزید کوئی شہادت اس کے پاس ہے۔ میں نے راجہ کو اشارہ کیا جو میرے ساتھ ہی عدالت کے ہال نما کمرے میں موجود تھا۔ اس نے جلدی سے پیچھے پلٹ کر اپنے بالکل پیچھے بیٹھے ایک عمر رسیدہ شخص کے کان میں کچھ کہا اور اس شخص نے اچانک ہی بھری عدالت میں کھڑے ہو کر آواز لگا دی۔

''جی..... دوسری شہادت میری ہے.....''

یکا یک عدالت میں پہلے گھمبیر سناٹا چھا گیا اور پھر اچانک ہی سبھی لوگ بیک وقت بولنے لگ گئے۔ جج نے اپنے لکڑی کے ہتھوڑے کو تین بار زمین پر مارا، آہستہ آہستہ سب چپ ہو گئے۔ عدالت نے اس بوڑھے شخص کو کٹہرے میں آنے کے لیے کہا اور وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گواہوں کے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ظفر کے چہرے پر اسے دیکھ کر بے چینی کے تاثرات پیدا ہونے لگے تھے۔

بوڑھے شخص نے عدالت کو بتایا کہ اس کا نام جہانگیر کاظمی ہے اور وہ ظفر کا ہمسایہ ہے اور جس رات غیاث چچا ظفر کو بلانے کے لیے اس کے گھر آئے تھے، وہ اپنے گھر پر ہی موجود تھا اور اچانک اس نے گلی میں ظفر کے زور زور سے چلانے اور کسی سے لڑنے کی آوازیں سنیں۔ حالانکہ یہ ساری گلی کے لیے معمول کی بات تھی کیونکہ ظفر کے قرض خواہ ہر روز ہی اس کے دروازے پر آ کر کوئی نہ کوئی تماشہ کر کے جاتے تھے لیکن پھر جب بات

طول پکڑنے لگی تو وہ باہر نکل آیا۔ اور اس نے دیکھا کہ غیاث چچا ظفر کی منت سماجت کر رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ گھر چل کر اپنی بیوی کو واپس لے آئے لیکن ظفر نے ان کی ایک نہیں سنی اور دوسرے ہی لمحے اپنے منہ سے طلاق کے تین لفظ نکال کر ہمیشہ کے لیے رشتہ ہی ختم کر دیا۔ یہ سنتے ہی غیاث چچا کو دل کا دورہ پڑا اور وہ وہیں ظفر کے دروازے پر ہی گر گئے، جنہیں اٹھا کر وہ لوگ قریبی ہسپتال پہنچا آئے۔ کاظمی صاحب کا بیان ختم ہونے تک عدالت میں چہ میگوئیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، جسے جج نے بڑی مشکل سے خاموش کرایا۔ عدالت نے تین مرتبہ کاظمی صاحب سے دوبارہ پوچھا کہ کیا انہوں نے اپنے کانوں سے طلاق کے لفظ سُنے تھے اور یہ تین مرتبہ کہے گئے تھے۔ کاظمی صاحب نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ انہوں نے مقدس کتاب کا حلف لیا ہے لہٰذا وہ جھوٹ ہرگز نہیں بول سکتے۔ انہوں نے خود اپنے کانوں سے واضح طور پر یہ لفظ سُنے تھے۔ جج نے قاضی صاحب کی طرف دیکھا جنہوں نے کاغذ پر کچھ لکھ کر جج کی جانب بھجوا دیا۔ جج نے بغور کاغذ کو دیکھا اور آدھے گھنٹے کے وقفے کے بعد فیصلہ سُنا دیا۔

''معتبر گواہوں کی شہادت اور تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مدعی ظفر کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ خود اپنی مرضی سے، اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اپنی بیوی وجیہہ بنت غیاث الدین کو طلاق دے چکا ہے لہٰذا عدالت اس کا دعویٰ خارج کرتی ہے اور وجیہہ بنت غیاث الدین کو اس کے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دیتی ہے۔''

عدالت میں ایک شور سا مچ گیا۔ عدالت نے ظفر کی غلط بیانی کے خلاف بھی سرکاری وکیل کو درخواست دائر کرنے کی ہدایت کی کہ کیوں نہ اس کے غلط بیان پر عدالت اس کے خلاف کارروائی کرے؟ عدالت میں ہی لوگوں نے ظفر کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیئے تھے لہٰذا وہ بڑی مشکل سے پیچھے کے دروازے سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔

اس شام بہت عرصے کے بعد میں نے غیاث چچا کے چہرے پر چھائے غبار کو بڑی حد تک ڈھلے ہوئے دیکھا۔ انسان کے اندر غم سہنے کا بھی قدرت نے کچھ عجیب سا نظام جوڑ رکھا ہے۔ شاید یہ سارا کھیل ہی اعصاب کا ہے۔ اور انسانی اعصاب پل پل اپنے آپ کو وقت اور حالات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، تبھی ہم ایک غم کو سہہ کر اپنا اگلا دن پھر سے شروع کر سکتے ہیں۔ ورنہ شاید ہم سب ہی اپنے پہلے غم کے ساتھ ہی خاک ہو چکے ہوتے۔ کاظمی صاحب کو عدالت میں لانے کا ہم نے اُسی دن فیصلہ کر لیا تھا جب عدالت نے دوسری گواہی طلب کی تھی۔ ظفر کا قصہ ختم ہوا تو زندگی دھیرے دھیرے پھر سے اپنے معمول کی جانب پلٹنے لگی۔

میرا انٹر کا رزلٹ بھی نکل چکا تھا اور حسب توقع میری پہلی پانچ پوزیشنز میں نامزدگی ہوئی تھی۔ چونکہ ہم سب کیڈٹس اپنی اکیڈمی سے ہی آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی (ISSB) کلیئر کر چکے ہوتے تھے لہٰذا فوج میں کمیشن لینے کا راستہ بھی فی الحال میرے لیے کھلا تھا لیکن جانے کیوں میری طبیعت پھر سے اتنے نظم و ضبط کے پھیرے میں پڑنے کی طرف مائل نہیں تھی۔ فجو مجھ سے روزانہ میری مستقبل کی پڑھائی کے بارے میں سوال کرتی تھیں اور میں روزانہ انہیں ایک ہی جواب دیتا کہ فی الحال مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ مزید پڑھائی کس شعبے کے لیے اختیار کروں۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے، اور پھر ایک دن قدرت نے خود ہی اس بات کا فیصلہ بھی کر ہی دیا کہ مجھے آگے کے لیے کون سی لکیر اختیار کر کے چلنا ہوگا۔

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

آخری نشتر

اُس دن فضلو بابا نے صبح سویرے مجھے ایک رجسٹری لا کر دی کہ غیاث چچا نے دی ہے اور کہا ہے کہ اسے پوسٹ بھی کر دوں اور اُس کی ایک نقل کروا کر دستی اُن کے دفتر دے آؤں۔ یہ ان کی مزید چھٹی کی درخواست تھی جس کے ساتھ اُن کا ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھی منسلک تھا۔ میں رجسٹری پوسٹ کروا کر اور اس کی نقل ان کے دفتر میں وصول کروا کر شام کو انہیں کاغذ واپس کرنے کے لیے گیا تو وہ چھت پر کبوتروں کے ڈربے کے پاس بیٹھے آس پاس ٹہلتے کبوتروں کو دانہ ڈالتے ڈالتے جانے کن سوچوں میں گم ہو گئے تھے کہ ان کا کبوتروں کو دانہ ڈالنے والا ہاتھ بھی ویسے ہی ہوا میں ٹھہرا رہ گیا تھا، میں نے کچھ دیر ان کی توجہ کا انتظار کیا اور پھر وہیں چھت کی منڈیر سے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ہلکے سے کھنکار کر انہیں متوجہ کیا۔ وہ چونک سے گئے اور پھر مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔

''ارے آدی بیٹا..... تم کب آئے..... آ جاؤ..... وہاں کیوں کھڑے ہو.....'' میں نے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر کاغذات رجسٹری کی رسید سمیت ان کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''چائے پیو گے.....''

''جی خالہ نے مجھے اوپر آتے دیکھ لیا تھا، وہ بھجواتی ہی ہوں گی..... آپ کن سوچوں میں گم بیٹھے تھے..... ڈاکٹرز نے آپ کو دل پر زیادہ بوجھ لینے سے منع کیا ہے۔''

وہ مسکرائے ''ارے میاں..... یہ ڈاکٹر بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں..... بوجھ لینے سے منع تو کرتے ہیں، لیکن بوجھ نہ لینے کا طریقہ نہیں بتاتے..... اور بھلا سوچوں پر کس کا اختیار ہے، کاش یہ ڈاکٹر کوئی ایسی دوا بھی ایجاد کر پاتے جس کو کھانے کے بعد یہ سوچیں اور یہ واہمے ہمیشہ کے لیے ہمارے دماغوں سے نکل جاتے۔''

میں نے دھیرے سے ان سے پوچھا۔

''اب آپ کو کون سا واہمہ پریشان کر رہا ہے۔ ہر تلخ اور ڈراؤنا واہمہ حقیقت بن کر آپ کے سامنے آ بھی چکا اور جانے کب سے ماضی کا حصہ بھی بن گیا، تو اب ان واہموں سے کیسا خوف؟..... اور ان کی فکر کیسی.....؟''

غیاث چچا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید انہیں میری زبان سے ایسی باتیں سن کر کچھ حیرت ہوئی ہو کیونکہ میں نے آج تک کبھی اس طرح بیٹھ کر ان سے زندگی کے کسی فلسفے پر بات نہیں کی تھی۔

''ہاں میاں..... کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو، ہر ڈراؤنا خواب حقیقت بن کر سامنے تو آ چکا..... اب اس سے زیادہ اور مزید کیا بُرا ہو گا؟ لیکن پھر

بھی انسان اپنے ماضی کو بھی 'کاش' کے نشتر سے بار بار کریدتا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے زخم کبھی بھر نہیں پاتے۔ میں بھی ایسے کئی 'کاش' کے نشتر اپنے آپ کو چبھونے کے لیے بیقرار رہتا ہوں....."

"مثلاً کیا.....؟ یہی نا کہ کاش آپ ڈھو کا ظفر سے رشتہ طے کرنے سے پہلے مزید چھان بین کر لیتے..... یا پھر یہ کہ رشتہ ہو ہی گیا تھا تو آپ کسی نہ کسی طرح اس رشتے کو پنپتے رہنے کا مزید اہتمام کرتے اور اسے اتنی آسانی سے ٹوٹنے نہ دیتے.....؟؟"

غیاث چچا نے غور سے میری جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر بولے۔

"ہمارا آدمی اب واقعی بڑا ہو گیا ہے..... اُسے اب بولے گئے لفظوں کے پس منظر کو پڑھنا بھی خوب آ گیا ہے....."

میں بھی مسکرا دیا۔

"چلیں اب تو بتا دیں..... یہی چندوا ہے گھیرے رکھتے ہیں نا آپ کو۔"

غیاث چچا نے لمبی سی سانس بھری۔

"ہاں میاں..... ہر لمحہ بس یہی خیال کاٹتا رہتا ہے کہ اپنی بیٹی کی بربادی کا کہیں نہ کہیں میں خود بھی ذمہ دار ہوں۔ اگر اُس رات میں ظفر سے بحث نہ کرتا تو....."

"تو کیا ہوتا..... یہی کہ ڈھو چند سال مزید اس جہنم میں اور گزار دیتیں..... یونہی ان کی وفاداری اور انا کو روزانہ کچلا جاتا اور یونہی وہ روز جیتی اور روز مرتی رہتیں، ظفر ان کو ڈھال بنا کر مزید آپ کو اور سکینہ خالہ کو خون کے آنسو رُلاتا رہتا، روز اسی طرح کے مزید تماشے ہوتے اور ڈھو کی روح ہر پل مزید زخمی ہوتی رہتی....."

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور پھر مجھے خیال آیا تو میں نے بڑی مشکل سے خود کو روکا، لیکن غیاث چچا میری بات سن کر سر جھکائے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے تھے، پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

"یہ سب دلیلیں میں خود کو دیتا رہتا ہوں۔ بات صرف میری اور سکینہ کی ہی ہوتی تو ہم خود وجیہہ کو جا کر اس عذاب سے نکال کر لے آتے، لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس معاشرے کے ساتھ چلنا اور رُکنا پڑتا ہے۔ یہاں طلاق یافتہ لڑکی کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، چاہے وہ کتنی ہی بے قصور کیوں نہ ہو..... الزام ہمیشہ اس کے سر ہی آتا ہے میاں....."

"اگر یہ سارا معاشرہ ایک جانب اکٹھا ہو جائے اور آپ سے یہ کہے کہ آپ دوسری جانب کھڑی ڈھو کو خود اُنہی کی مرضی سے کسی اندھے کنویں میں دھکیل آئیں تو کیا آپ ایسا کریں گے؟ میں مانتا ہوں کہ عام حالات میں ہمیں اسی معاشرے کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا پڑتا ہے، اور اسی کی پرکھی ہوئی عزت اور بے عزتی کی کسوٹی کو اپنے لیے بھی سچ ماننا پڑتا ہے، لیکن میں نے کہا نا..... یہ صرف عام حالات میں ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ڈھو پر بیتی اسے صرف ڈھو یا آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اُن کے اپنے ہیں، آپ پر اُس عام معاشرے کے اصول لاگو نہیں ہوتے، اور پھر ان سب باتوں کے باوجود، آپ نے اپنی طرف سے تو ہر ممکن نبھانے کی کوشش بھی تو کی۔ لیکن اگر اس کے باوجود نتیجہ اگر آپ کی توقعات کے برعکس نکلا ہے تو آپ

اسے قدرت کی جانب سے کوئی غیبی مدد کیوں نہیں سمجھ لیتے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوا کہ وہ اس ظالم اور کم ظرف شخص کے چنگل سے نکل آئیں؟ کیا آپ یہ چاہتے تھے کہ وہ ساری زندگی اس جھوٹے اور دوغلے معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں کی بھینٹ چڑھتی رہتیں اور ان کی باقی عمر بھی اسی دوزخ میں جل جاتی.....؟؟''

غیاث چچا کے پاس میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا، اتنے میں وجو کے کھنکارنے کی آواز آئی اور وہ چائے کی ٹرے اٹھائے آتیں نظر آئیں۔ ہماری باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ غیاث چچا نے اٹھتے ہوئے وجو سے کہا۔

''چلو بھئی تم دونوں چائے پیو۔ میں کچھ ضروری کاغذات اپنی دراز سے چھانٹ لوں۔''

غیاث چچا دو قدم بڑھے اور پھر جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری جانب پلٹے۔ اور قریب آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر بولے۔

''تمہارا زندگی کو دیکھنے کا نظریہ اچھا لگا مجھے..... کوشش کروں گا کہ آئندہ میں بھی تمہارے نظریے سے زندگی کو دیکھ سکوں، کیونکہ مجھے تمہاری کہی ہوئی ہر بات سے اتفاق ہے۔''

غیاث چچا میرے بال سہلا کر مسکراتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ میری نظر وجو پر پڑی، وہ سادہ سے سفید لباس میں ملبوس تھیں اور ان کا سوگوار سا حسن جانے کیوں مجھے اس ڈھلتی شام کی طرح لگ رہا تھا، لیکن اس وقت وہ بے حد حیرت سے اور کچھ عجیب نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں اپنے مخصوص انداز میں چھیڑا۔

''کیا دیکھ رہی ہیں ایسے..... نظر لگائیں گی کیا.....؟''

وہ چونک کر بولیں۔

''نظر ہی لگ جانے کا خدشہ ہے آج مجھے۔ میں کافی دیر سے سیڑھیوں پر کھڑی تمہاری اور ابا کی باتیں سن رہی تھی، ایسا کرنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن تم جس طرح ابا کو سمجھا رہے تھے، اسے سن کر مجھے درمیان میں ٹوکنا مناسب نہیں لگا۔ تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں آدی.....؟ میں تو اب تک حیران ہوں۔ کتنی خوبصورتی سے تم نے ابا کو ان کے دکھوں کو برتنے کا ایک نیا نظریہ دے دیا۔ کیا یہ میرا وہی ننھا منا سا دوست بول رہا تھا..... مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا.....''

میں ان کی یہ لمبی تمہید سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

''جہاں آپ نے مجھے بھیجا تھا وہیں سے سیکھ کر آیا ہوں، اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ اب میں پرائمری اسکول میں منہ بسور بسور کر جانے والا آدی نہیں رہا، آپ کے سامنے کیڈٹ کالج کا پاس شدہ کیڈٹ عباد بیٹھا ہوا ہے۔ جو اس کے امی کے بقول اپنے ابا سے بھی قد میں آگے نکل گیا ہے.....''

وجو زور سے ہنسیں۔ جل ترنگ سے بج گئے۔

''ہاں بھئی..... یہ تو میں بھول ہی گئی کہ ہمارا آدی اب کیڈٹ عباد بن کر واپس لوٹ آیا ہے، سوری سر کیڈٹ عباد۔''

ڈھو نے ہنستے ہوئے سیلوٹ کے انداز میں اپنا ہاتھ ماتھے تک اٹھا دیا۔ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا اور وہ ناراضگی سے بولیں۔

''ارے ہاں..... یاد آیا..... یہ تم ابا کے سامنے مجھے صرف ڈھو کہہ کر کیوں پکار رہے تھے، پورا ڈھو آپی کیوں نہیں کہا.....''

''ڈھو آپی کہنے سے ایسا لگتا ہے، جیسے میں شکورن بواء کی عمر کی کسی بڑھیا کا ذکر کر رہا ہوں، اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ ابھی سے آپ کی عمر کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔''

اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی اور ڈھو چائے بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن سچ یہی تھا کہ جب سے میں اکیڈمی سے واپس آیا تھا، چاہے انجانے میں ہی سہی، لیکن جانے کیوں میرے لبوں سے ان کے لیے وجو آپی کی جگہ صرف ڈھو ہی نکلتا تھا۔

اُس شام کے بعد سے میری اور ڈھو کی ازلی دوستی نے ایک نیا رخ پلٹا۔ وہ اب مجھ سے اپنی ہر وہ بات بھی بانٹنے لگ پڑی تھیں جو پہلے وہ مجھے چھوٹا سمجھتے ہوئے نظر انداز کر جایا کرتی تھیں۔ موسموں کی باتیں، شاعری کی باتیں، خزاں میں گرتے پتوں کی باتیں، نیلے گگن کے آوارہ بادلوں کی باتیں، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ زیادہ تر بلکہ تقریباً سبھی معاملوں میں ہماری پسند یکساں ہی تھیں، انہیں بھی میری طرح برستی بوندیں بارش اور سب کچھ دودھیا کر دینے والی برف باری پسند تھی۔ وہ بھی خزاں کے پتوں کے گرنے کی آہٹ کو خوب محسوس کرتی تھیں اور انہیں بھی آسمان پر بکھرے بادلوں کو کسی رنگین شیشے سے دیکھنا بہت بھلا لگتا تھا۔ ہماری پسند کے سبھی موسم ایک جیسے ہی تھے۔ وہ بھی غالب کی دیوانی تھیں اور میر اور خیام ان کے شیلف میں سجے رہتے تھے۔ وہ بھی میری طرح ہر منظر کو ایک الگ نظر اور نظریے سے دیکھنے کی عادی تھیں۔ سخت سردیوں میں لوگ جب آگ کے گرد ٹھٹھر رہے ہوتے تب ہم دونوں گولہ گنڈہ یا برف ملائی کی قلفیاں کھا رہے ہوتے تھے۔ انہیں بھی میری طرح پیانو اور وائلن پر بجائی گئی دھنیں بے حد پسند تھیں۔ اور میں بھی ان کی طرح گہرے سیاہ اور شفاف سفید رنگ کا دیوانہ تھا۔ اردو ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مضمون تھا اور دونوں کو ہی ریاضی سے شدید چڑ تھی۔ دونوں کو ہی ذرا سی مرچ کھاتے ہی ہچکیاں لگ جاتی تھیں اور دونوں کو ناریل پانی اور اناناس کا رس بہت مزے کا لگتا تھا۔ ڈھلتی دھوپ کے زاویوں کو تکنا اور آسمان پر بکھرے بادلوں سے مختلف خاکے جوڑنا اور ذہن میں ان کی تصویریں بنانا ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ غرض کون سی ایسی بات تھی، جس میں مماثلت نہ ہو؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے وجو کی ہر پسند کو محسوس کیا تھا اور اُسے اپنے اندر اتارا تھا۔ اور پھر ایک ایسے ہی دن ڈھو نے باتیں کرتے کرتے اچانک مجھ سے کہا۔

''آدی..... تم مقابلے کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے..... میں جانتی ہوں تم ضرور کامیابی حاصل کرو گے۔''

بس وہی دن تھا، جب میں نے آخر کار طے کر لیا کہ مجھے مستقبل میں کیا کرنا ہے۔ غیاث چچا کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ڈھو مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں اور سول آفیسر بنیں۔ قسمت نے پلٹا کھایا اور اُن کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی، اب وہی ذمہ داری ڈھو نے میرے کاندھوں پر ڈال دی تھی، اور میں جانتا تھا کہ مجھے ہر حال میں ڈھو کا یہ ٹوٹا خواب پھر سے جوڑنا ہے اور مجھے سول آفیسر بننا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

پہلی نظر

مجھے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے چھ ماہ سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ پرائیویٹ بی۔اے کا امتحان دیتے ہی مقابلے کے امتحان کے فارم بھی بھر دوں گا تاکہ مزید ایک لمحہ بھی ضائع کیے بنا امتحان میں شریک ہو سکوں۔ ڈھو کی مدد سے میں نے مضامین بھی وہی منتخب کیے تھے، جو بیک وقت بی۔اے اور سول سروس کے امتحان میں مشترک تھے اور ظاہر ہے کہ اردو ان میں سرِ فہرست مضمون تھا۔ یہ سارے مضامین وہی تھے، جن میں ڈھو پہلے ہی گریجویشن کر چکی تھیں اس لیے میری رہنمائی کرنے میں انہیں کوئی مشکل نہیں ہوئی اور ان کی آنکھوں کا سپنا میری پلکوں تلے منتقل ہو گیا۔ کبھی کبھی تو غیاث چچا ہم دونوں کی گھنٹوں کی بحث اور مضامین کے متعلق خیالات کی کھینچا تانی دیکھ کر مسکرا دیتے کہ ''یوں لگتا ہے کہ جیسے مقابلے کے امتحان میں آدمی نے نہیں، ڈھو نے بیٹھنا ہے۔'' اور سچ یہی تھا کہ وجو نے کوئی کسر بھی نہیں چھوڑ رکھی تھی ہر مضمون کو گھول کر مجھے پلانے میں۔ ویسے بھی وہ زندگی کے اس معاملے میں کاملیت پسند (Perfectionist) تھیں اور وہ کوئی بھی وجہ یا بہانہ قسمت یا مقدر کے لیے ایسا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں، جس کی بنا پر کل ہمیں یہ کہنا پڑتا کہ کاش یوں کر لیتے..... کاش وہ کتاب بھی دیکھ ہی لیتے..... کاش یہ باب بھی زیر بحث لے ہی آتے..... وغیرہ وغیرہ، لہٰذا ہم دونوں ہی اُس امتحان کی تیاری کے لیے یوں جُتے ہوئے رہتے جیسے کل ہی ہمارا پہلا پرچہ ہو۔

لیکن اس طوفانی تیاری کا ایک اثر یہ ہوا تھا کہ میں اپنے دوستوں کو پورا وقت نہیں دے پاتا تھا جس پر راجہ کی ہر وقت کی بک بک اور باقیوں کی نان اسٹاپ کمنٹری جاری ہی رہتی تھی۔ آخر کار بے حد لمبی بحث اور درجنوں جھگڑوں کے بعد طے ہوا کہ باقی پورا ہفتہ چاہے میں کچھ بھی کروں کہیں بھی غائب رہوں لیکن جمعرات کی شام سے لے کر رات دیر گئے تک میرا وقت میرا نہیں بلکہ ان سب ''لوفروں'' کا ہوگا۔ ایسے میں ہماری ابتدائی بیٹھک ہمیشہ بالے کے گیراج پر ہوتی تھی۔ بالے نے میٹرک کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا اور پرائیویٹ ایف۔اے کیا تھا کیونکہ میٹرک کے بعد اس کے ابا نے اسے گھر کے حالات کی وجہ سے ایک چھوٹا سا گیراج کھلوا دیا تھا، جس میں ان کی تمام پینشن اور گریجویٹی کی رقم صرف تو ہو چکی تھی لیکن کم از کم ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ بھی میسر آ گیا تھا۔ بالے کو اسکول کے دور سے ہی موٹر گاڑیوں اور اس کی مشینری میں بے حد دلچسپی تھی۔ پانچویں میں آنے تک وہ آدھے گھنٹے میں ہمارے دینیات کے ماسٹر حافظ صاحب کی ٹرائف موٹر سائیکل کھول کر پُرزہ پُرزہ کر دیتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اسے دوبارہ جوڑنے میں اسے ہفتہ لگ جاتا تھا اور تب تک حافظ صاحب پیدل آتے جاتے اس گھڑی کو کوستے رہتے کہ انہوں نے بالے کو موٹر سائیکل کی خرابی دیکھنے کا کہا ہی کیوں تھا۔ لیکن اب بالا گاڑیوں کے کام کا ایسا ماہر تھا، جو انجن کی آواز سُن کر ہی اس کی بیماری کوس بھر کے فاصلے سے بتا دیتا تھا۔

راجہ اور نھو کی ''تعلیم'' جاری تھی اور دونوں ہی تیسری مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ مُشی اور گڈو نے انٹرمیڈیٹ

تو جیسے تیسے کر ہی لیا تھا لیکن وہ بھی اب پرائیویٹ تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے کیونکہ دونوں ہی کسی سرکاری محکمے میں بابو بھرتی ہو چکے تھے۔ لیکن ان سب باتوں نے ہماری ازلی بچپن کی دوستی پر ذرہ برابر فرق بھی نہیں ڈالا تھا۔ جب ہم سب ملتے تھے تب صرف ہم ہی ہوتے تھے اور ہمارے ساتھ صرف ہمارے بچپن کا دسمبر.....

سچ ہے کہ سچی دوستی ایسے کسی بھی بھید بھاؤ یا ذہنی استطاعت کے فرق سے بہت بلند ہوتی ہے۔ ہمارے قہقہے آج بھی روزِ اول کی طرح خالص تھے اور ہماری ایک دوسرے کے لیے فکر اور پریشانی کا وہی عالم تھا، جو پہلی دوسری جماعت کے وقت ہوتا تھا۔

ہم جمعرات کی شام سب کچھ بھول کر مناتے تھے۔ ایسے میں زیادہ تر پروگرام راجہ کے ترتیب دیئے ہوئے ہوتے تھے۔ کبھی وہ ہمیں کوئی نئی فلم دکھانے کے لیے لے جاتا، اس کے ٹکٹ لینے کے طریقے ابھی تک وہی بچپن والے تھے۔ اور کوئی نہ کوئی ''شاہ صاحب'' قسم کی شخصیت یا بہانہ اس کو مل ہی جاتا تھا۔ حالانکہ اب ہم بھی اپنے تمام دوستوں کے لیے سب سے مہنگا ٹکٹ خرید کر فلم دیکھ سکتے تھے لیکن ایسی فلم کا مزہ کیا.....؟ لہٰذا فلم کا موضوع ہم نے راجہ کے ہی سپرد کر رکھا تھا، کبھی ہم شہر سے باہر جھیل پر پکنک کے لیے چلے جاتے اور خوب ہلہ گلہ کرتے۔ جھیل کے کنارے لکڑی کے وہ پرانے خستہ حال بینچ اور تختے ابھی تک موجود تھے، جن پر ہمارے بچپن کے کھدے ہوئے نشان آج بھی باقی تھے۔ کبھی گیراج ہی میں رات کی دعوت کا پروگرام بن جاتا اور ہم سب گیراج کے ہی چھوٹے سے باورچی خانے میں مل کر مختلف تجربے کرتے رات بتا دیتے۔

جمعرات کی اس شام کی چھٹی مجھے خصوصی طور پر ڈھو کی طرف سے بھی تھی۔ میں انہیں اکثر اپنے دوستوں کی شرارتوں کے بارے میں بتاتا رہتا تھا اور وہ یہ سُن کر مسکراتی رہتی تھیں۔ پھر ایک دن جب میں نے انہیں تفصیل سے راجہ، بالے، نھو اور گڈو کی ان باتوں اور کوششوں کے بارے میں بتایا جو وہ میری غیر موجودگی میں ڈھو کی حفاظت کی غرض سے اپنے طور پر ہی کرتے رہے تھے اور جن معصومانہ کوششوں اور منصوبوں کا ڈھو کو کبھی پتہ ہی نہیں چل پایا تھا، تو وہ سب سن کر بہت دیر تک ڈھو کی آنکھیں نم رہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس جمعرات کی شام کو میں اپنے سارے دوستوں کو اُن کے گھر اُن کی طرف سے چائے کی دعوت پر بلا لاؤں۔ جب ان سب نے میری زبانی یہ خبر سنی تو سارے کے سارے ہکا بکا رہ گئے۔ کیونکہ ان سب کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات موجود تھی کہ ڈھو انہیں نکما اور آوارہ سمجھتی تھیں، اور میں جانتا تھا کہ بچپن میں کسی حد تک یہ ٹھیک بھی تھا کیونکہ ڈھو جب مجھے سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ محلے کے بڑے میدان میں دھما چوکڑی مچاتے ہوئے دیکھتی تھیں تو مجھے ان سے ڈانٹ بھی پڑتی تھی کہ سارا دن اپنے ''آوارہ'' دوستوں کے ساتھ ضائع نہ کیا کروں۔

ڈھو کی دعوت کا سُن کر پہلے تو سبھی شاک اور سکتے میں آ گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد سب کو اپنے اپنے لباس کی فکر پڑ گئی کہ انہیں کیا پہن کر ڈھو کے گھر جانا چاہیے۔ آخر یہ سب کی 'عزت' کا سوال تھا۔ ڈھو کی نظر میں اچھا بننے کا ایک موقع قدرت نے دے ہی دیا تھا تو پھر ان میں سے کوئی بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کا بھی ڈھو سے ایک عجیب سا رشتہ تھا، بچپن سے وہ میرے ذریعے اس رشتے سے جُڑے ہوئے تھے، ڈھو ان سب کو عزیز تھیں کیونکہ وہ ان کے سب سے پیارے آدمی کی ڈھو تھیں۔ وہ سب انہیں یوں سنبھال سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے، جیسے وہ اپنے دوست آدمی کا سب سے قیمتی کھلونا سنبھال رہے ہوں جو آدمی ان کو کچھ لمحوں کے لیے بطور امانت دے کر ذرا سی دیر کے لیے کہیں گیا ہو.....

ہم سب میں بچپن سے راجہ ہی سب سے زیادہ ''خوش لباس'' تھا اور وہ ہر نیا فیشن ٹرائی ضرور کرتا تھا لہٰذا اس موقع پر بھی اس کی الماری ہی ان سب کے کام آئی، اور کچھ ہی دیر میں وہ سب خاصے معقول نظر آنے لگے، راجہ میرے لیے بھی اپنا پسندیدہ گرے کوٹ لے کر آیا تھا لیکن میں نے ان کے ہاتھ جوڑے کہ میں اسی جین شرٹ میں ٹھیک ہوں، لہٰذا اب وہ سب چلنے کی کریں کیونکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔

ڈھو کے دروازے پر غیاث چچا نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں بتایا کہ ڈھو نے چھت پر چائے کا بندوبست کیا ہے، لہٰذا ہم سب بھی چھت پر ہی چلے جائیں۔ چھت پر تو ڈھو نے واقعی پوری چھوٹی موٹی دعوت کا انتظام کر رکھا تھا اور میز پر چائے کے ساتھ جتنے لوازمات ہو سکتے تھے وہ سبھی موجود تھے۔ اور اس میں بھی آدھی سے زیادہ چیزیں خود ڈھو کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ ڈھو کا چہرہ ہم سب کو آتے دیکھ کر کھل سا گیا۔ وہ میرے سارے دوستوں کو اچھی طرح جانتی تھیں کیونکہ ہم سب اسی محلے میں ان کے سامنے ہی تو بڑے ہوئے تھے لیکن اس شام انہوں نے سب سے فرداً فرداً سب سے خصوصی طور پر ہاتھ ملایا اور سب سے پوچھا کہ وہ کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ سبھی شرما شرما کر جواب دیتے رہے اور پھر جب ڈھو نے تعارف کے وقت راجہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بالے کے بال بکھیر دیئے تو وہ دونوں ہی خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں، بالے کی آنکھوں سے تو باقاعدہ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگ گئے۔ ڈھو آپی ''ارے ارے'' ہی کرتی رہ گئیں اور وہ سبھی اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔ پھر ایسے میں بھلا ڈھو کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ اگلے ہی لمحے خود وہ بھی بھل بھل رو رہی تھیں کیونکہ انہیں تو ویسے بھی رونے کا بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔ آنسوؤں کی کمی تو کبھی نہیں رہی تھی ان کے پاس اور میں بے چارہ ان سب سے دور چھت کی منڈیر پر اپنا سر تھامے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ دیر بعد غیاث چچا اوپر آ گئے اور انہیں آتا دیکھ کر وہ سارا ''گروپ مقابلہ'' ختم ہوا ورنہ چائے کی خیالی پیالیاں ان سب کے بہتے آنسوؤں سے ہی بھر جاتیں۔ غیاث چچا نے مجھ سے اشاروں میں پوچھا کہ ہوا کیا ہے؟ میں نے بے چارگی سے سر ہلا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ ان سب کو اللہ ہی سمجھائے۔ غیاث چچا دھیرے سے مسکرا دیئے اور ہمیں اطلاع دی کہ ریحان صاحب اپنے دونوں بچوں کے ساتھ نیچے آئے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ انہیں بھی یہیں چھت پر لے آئیں۔ ہم سب نے کہا ''بڑی خوشی سے'' اور کچھ لمحوں بعد ہی ریحان صاحب بھی اپنے بچوں سمیت ہماری ''ٹی پارٹی'' میں شامل ہو چکے تھے۔ ڈھو نے میرے سارے دوستوں کا فرداً فرداً خصوصی طور پر ریحان صاحب سے بھی تعارف کروایا، اور وہ مسکرا مسکرا کر سبھی سے ملتے رہے۔

ڈھو آپی نے بہت عرصہ پہلے ہی کیس کے ختم ہونے کے بعد ریحان صاحب کے گھر ٹیوشن کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب ان کا من کہیں آنے جانے کا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی اب انہیں ٹیوشن پڑھانے کی ضرورت تھی، البتہ دونوں بچے اب بھی تقریباً ہر ہفتے ڈرائیور کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اپنی کتابیں اٹھائے وجو کے پاس ضرور آ جاتے تھے اور ان سے ضروری ٹیوشن لے لیتے تھے۔ اس شام بھی ریحان صاحب نے وجو سے دوبارہ درخواست کی کہ یہ سال تو اب خاتمے پر ہے لیکن اگلے سال بچوں کو دو ماہ بعد ان کی مدد کی شدید ضرورت ہو گی کیونکہ تب ان کی نئی کلاس شروع ہو چکی ہو گی۔ لہٰذا تب انہیں ان کے بچوں کا باقاعدہ ٹیوشن پڑھانا ہی ہو گی۔ وجو نے انہیں تسلی دی کہ فی الحال نئی کلاس شروع ہونے میں کافی دیر ہے وہ ابھی سے پریشان نہ ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وجو نے صرف میری پڑھائی کی وجہ سے خود کو اس مصروفیت سے باز رکھا ہوا ہے، کیونکہ وہ اپنی

پوری توجہ میرے مقابلے کے امتحان کی تیاری پر دینا چاہتی تھیں۔

رات کو جب ہم گیراج واپس آئے تو سبھی رات گئے تک صرف ڈھو کی ہی باتیں کرتے رہے۔ سبھی کا بس یہی کہنا تھا کہ یہ اُنہی کی ہمت ہے جو اتنے بڑے دُکھوں کے ساگر سے گزر کر بھی ابھی تک اپنے آپ کو مجتمع رکھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کسی بھی خوشی یا بڑائی کا ذکر کرتے ہوئے ماشاء اللہ ضرور کہنا چاہیے۔ ورنہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہو اُسے نظر لگ جاتی ہے۔ لیکن شاید اس روز ہم سب ڈھو آپی کے ذکر پر ماشاءاللہ کہنا بھول گئے تھے۔ لہٰذا شاید اس بار ہماری ہی نظر ڈھو کی خدا خدا کر کے پُرسکون ہوتی زندگی کو لگ گئی۔ لیکن ہم کیا جانتے تھے کہ اس کانچ کی شہزادی کی قسمت کا پیراہن بھی اتنے ہی نازک کانچ کا بنا ہوا ہوگا کہ ہماری ایک ذرا سی ماشاءاللہ نہ کہنے کی بھول بھی اسے ٹھیس لگانے کا سبب بن جائے گی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آخری کفارہ

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

اگلے دن جمعہ تھا اور راجہ مجھے لے کر جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے بالے کے محلے چلا گیا کیونکہ اُسے بالے کو اپنے ابا کی فوکسی کار دکھانا تھی جس کی عمر راجہ کی عمر سے دو چار سال زیادہ ہی ہوگی البتہ راجہ کے ابا نے یہ مصیبت ابھی پچھلے سال ہی خریدی تھی۔ ہم سب دوستوں نے اس فوکسی کا نام بلیلہ رکھ چھوڑا تھا اور بلیلہ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی سڑک پر کھانستی ہوئی کھڑی ملتی تھی۔

بالے نے ہم سے کہہ رکھا تھا کہ ہم جمعے کی نماز پڑھ کر جامع مسجد کے باہر ہی اس کا انتظار کریں پھر ہم ایک ساتھ ہی گیراج چلیں گے۔ میں اور راجہ مسجد کے باہر کھڑے بالے کا انتظار کر رہے تھے، راجہ نے اُکتا کر کہا۔

''یار آدی..... لگتا ہے اس بالے کے بچے نے بھی آج ہی اپنے سارے گناہ بخشوانے کی ٹھان رکھی ہے۔ اب تو ساری مسجد خالی ہوگئی ہے۔ جانے وہ کہاں رہ گیا ہے۔'' میں نے راجہ کو تسلی دی اور خود مسجد کی طرف بالے کو ڈھونڈنے کی غرض سے چل پڑا۔ مسجد کا صحن تقریباً خالی پڑا ہوا تھا اور وسیع صحن میں دور ایک باریش شخص سر پہ سفید ٹوپی رکھے ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص دعا مانگتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے اور اس کا چہرہ دُور سے بھی آنسوؤں کی چمک سے دُھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی بہت لمبے اور شانوں تک تھے اور داڑھی بھی شرعی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک میری توجہ بالے کی جانب مبذول ہوگئی جو اندر سے مولوی صاحب کے ساتھ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ بالے نے مجھے دیکھا تو جلدی سے مولوی سے رخصت ہو کر میری جانب چلا آیا۔ میں نے اسے ڈانٹا کہ اتنی دیر کہاں لگا دی۔ بالے نے بتایا کہ وہ نکل ہی رہا تھا کہ مولوی صاحب نے اسے روک لیا اور صحن کی پچھلی جانب مسجد کی پانی کی موٹر دکھانے کے لیے لے گئے جو پچھلے چند دنوں سے گڑبڑ کر رہی تھی اور آج تو بالکل رُک ہی گئی تھی۔ اسی موٹر کو چلانے میں کچھ دیر لگ گئی تھی اُسے۔ بالا آگے بڑھنے لگا تو میں نے اسے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا اور اسے صحن میں بیٹھے باریش شخص کی جانب متوجہ کیا کہ جانے اُسے کیا مسئلہ کیا تکلیف ہے؟ میں نے بالے سے کہا کہ جا کر اس شخص سے پوچھ آئے کہ اُسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔ بالے نے میری جانب حیرت سے دیکھا۔ ''ارے یار..... تو نے اُنہیں پہچانا نہیں..... یہ اُلّو بھائی ہیں۔''

''اُلّو''..... میرے ذہن میں بیک وقت کئی جھماکے ہوئے۔ اُلّو کی صحت تو قابلِ رشک تھی لیکن یہ شخص تو ہڈیوں کا پنجر دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر اس کا حلیہ تو بالکل ملنگوں جیسا تھا جبکہ اُلّو تو ہمیشہ بہترین کپڑے پہنتا تھا چاہے اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہ آتا ہو..... اور پھر اس شخص کا چہرہ..... مجھے یہ بات خود اُلّو کے سگے بھائی کے منہ سے نہ پتہ چلتی تو میں کبھی اس بات پر اعتبار نہ کرتا، بالے نے مجھے بتایا کہ اب اُلّو کا ہر نماز کے بعد

دعا مانگنے کا یہی طریقہ ہے، اور وہ گھنٹوں اسی جذب کے عالم میں مسجد میں بیٹھا اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا ہے۔ گزر بسر کے لیے اگو نے کرائے پر ایک ٹیکسی لے رکھی تھی اور وہ صبح سے رات تک وہ ٹیکسی چلاتا تھا، اور اس پرانی ٹیکسی سے دن بھر جو بھی کماتا، وہ سیدھے رات کو اپنی ماں کے قدموں لے جا کر ڈال دیتا تھا۔ اُسی نے اپنے سیٹھ سے کہلوا کر اپنی بہن گڈی کے لیے سیٹھ کے منشی کے بیٹے کا رشتہ بھی طے کروا دیا تھا۔ لڑکا کسی سرکاری محکمے میں سپرنٹنڈنٹ بھرتی تھا اور اچھے شریف لوگ تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی انسان کی اتنی بڑی کایا پلٹ ہوتے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگو کا حلیہ بھی اس قدر بدل چکا تھا کہ اگر وہ میرے سامنے سے بھی گزرتا تو شاید میں بالے کے بتائے بنا اُسے پہچان نہ پاتا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ چند روز بعد جب ڈھو اور سکینہ خالہ فضلو بابا کے ساتھ محلے سے برگدوالے پیر بابا کے مزار پر منت کا چڑھاوا چڑھانے نکلیں اور فضلو بابا نے ایک پرانی سی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا تو ان تینوں میں سے کوئی بھی اگو کو نہیں پہچان سکا۔ ایک تو ویسے بھی شام کے جھٹ پٹے کا وقت تھا اور مغرب قریب تھی اور دوسرے یوں بھی عورتوں کی نظر جھکی ہوئی تھی۔ رہے فضلو بابا تو اب تو وہ ہم کو بھی بمشکل پہچان پاتے تھے۔ وجو نے غیاث چچا کی صحت یابی کے لیے جانے کب سے نذر کی منت مانگ رکھی تھی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ان کا جانا مؤخر ہو ہی جاتا تھا۔ ڈھو نے مجھے بھی میری پڑھائی کا وقت ضائع ہونے کے خدشے سے نہیں بتایا تھا کہ وہ مزار جائیں گی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ سڑک سے ٹیکسی لے کر اُسی ٹیکسی میں مزار کے احاطے کے باہر اُتر کر اُسے رُکنے کا کہہ دیں گی اور چند لمحوں میں ہی چادر چڑھا کر اور نیاز بانٹ کر اُسی ٹیکسی میں واپس آ جائیں گی۔ نیاز کا وقت بھی مغرب کی نماز کے بعد کا مقرر ہوتا تھا اور مزار کے احاطے میں بھی سبھی نیازی مغرب کے بعد ہی نیاز بانٹتے تھے۔

ان تینوں میں سے تو کوئی بھی اگو کو نہیں پہچان پایا لیکن اگو بھلا وجو اور سکینہ خالہ کی صورت کو کیسے بھلا سکتا تھا؟ ان سب کی زندگی اگو کے جرم کی وجہ سے برباد ہو گئی تھی۔ اگو نظریں سڑک پر جمائے ٹیکسی چلاتا رہا اور اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلتی رہیں۔ بالے کی زبانی اُسے وجو کی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اور ہر بار وہ خود کو اُسی شرمندگی اور احساسِ جرم کے گڑھے میں گرا محسوس کرتا تھا، جس کی تپش سے بچنے کے لیے اُس نے خود اپنا آپ بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

اگو کی ٹیکسی مزار کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اگو یا ان تینوں میں سے کسی نے بھی یہ بات نوٹ نہیں کی تھی کہ ان کے محلے سے نکلتے ہی ایک اور پرانی فیاٹ کار ان کی ٹیکسی کے پیچھے ہی فوراً روانہ ہو گئی تھی اور اب تک لگاتار اُن کا پیچھا کرتی چلی آ رہی تھی۔ اگو نے اپنی ٹیکسی مزار کے احاطے کے باہر روک دی اور فضلو بابا دونوں عورتوں کو لے کر اندر چلے گئے۔ اگو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سکینہ خالہ اور ڈھو کے پاؤں پکڑ لے اور تب تک اپنا سر اُن دونوں کے قدموں میں پٹختا رہے جب تک وہ اسے دل سے معاف نہ کر دیں۔

اگو بھی ٹیکسی سے باہر نکل آیا اور اُس نے مغرب کی نماز وہیں احاطے کے باہر ہی کپڑا ڈال کر پڑھ لی۔ اتنے میں اندر سے ڈھو لوگ بھی باہر نکلتے دکھائی دیے۔ اگو نے جلدی سے عورتوں کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا اور خود انتظار کرنے لگا کہ وہ بیٹھ جائیں تو دروازہ بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کرے۔ سکینہ خالہ ایک طرف سے اور ڈھو دوسری طرف سے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے آگے بڑھیں، اسی اثنا میں اچانک اگو کی ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر کھڑی اُسی فیاٹ کار میں سے ایک شخص، خود کو کالی چادر میں لپیٹے، تیزی سے نکلا اور ڈھو کی طرف لپکا، اس کے ہاتھ میں کوئی شیشے کی بوتل تھی،

جس کا ڈھکنا اس نے پہلے ہی سے کھول رکھا تھا، وہ اس کے سراپے سے سراسیمہ سی ہو کر پیچھے کو ہٹیں لیکن پیچھے ٹیکسی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ نے اس شخص کے چادر سے جھلکتے آدھے چہرے کو پہچان لیا۔ وہ ظفر تھا جو اپنے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل لئے ان کی جانب لپکا تھا۔ وہ آپی گھبرا کر چلائیں۔ اگو بوکھلا کر پلٹا اور اس نے کسی چادر بردار شخص کو وجو کی جانب کچھ پھینکتے ہوئے دیکھا، اس شخص کا ہاتھ ابھی پوری طرح ہوا میں ہی تھا کہ اگو نے ایک ثانیے کی تاخیر کئے بنا جھپٹ کر اس شخص کا ہاتھ دبوچ لینا چاہا، لیکن تب تک وہ آتشی سیال بوتل سے پوری طرح چھلک چکا تھا، لیکن تب تک اگو، وجو اور اس سیال مادے کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ اگو کے منہ سے کرب کے مارے ایک زوردار کراہ نکل گئی اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ اور سینے پر انگارے ڈال دیئے ہوں۔ گردن کا کچھ حصہ بھی متاثر ہوا اور تیزاب کے چھینٹے اس کے چہرے تک آئے تھے لیکن شدید تکلیف نے اسے آنکھیں میچ لینے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے اس کی آنکھیں ان چھینٹوں سے بچ گئیں۔ لمحہ بھر میں ہی مزار کے باہر بھگدڑ مچ گئی۔ ظفر اگلے ہی لمحے لپک کر بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا اور وہ پرانی فیاٹ بھی اُسی لمحے ریورس ہو کر کہیں گم ہو گئی تھی۔ اگو کا تکلیف کے مارے برا حال تھا۔ وہ کو خراش تک نہیں آئی تھی آس پاس چند دوسرے رکشہ اور ٹیکسی والے بھی تھے، جن میں سے کوئی ایک آدھ شاید اگو کو جانتا بھی تھا اسی لیے وہ لپک کر بھیڑ میں سے نکلا اور زور سے چلایا۔ ''ارے..... یہ تو اپنا اگو اُستاد ہے یار..... جلدی کرو، اسے اپنی ٹیکسی میں ڈالو..... یہ تو بُری طرح سے جل گیا ہے۔''

اگو کا نام سن کر وجو اور سکینہ خالہ دونوں ہی بُری طرح سے چونکے اور اب انہوں نے غور سے ٹیکسی والے کی جانب دیکھا تو بیچ میں سے اگو کے خدوخال اُبھر آئے۔ لیکن اس وقت وہاں ایک ہلا مچا ہوا تھا۔ اگو نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا لیکن پھر بھی اُس نے کسی دوسرے ٹیکسی والے کو ہدایت کی کہ یہ بیبیاں اس کے پرانے محلے کی سواری ہیں لہٰذا وہ انہیں سیدھے اور بہت حفاظت سے ان کے گھر چھوڑ آئے۔ فضلو بابا نے اگو کے ساتھ جانے کی کوشش کی لیکن اگو نے انہیں منع کر دیا کہ اس وقت وہ وجو اور خالہ کو لے کر سیدھے گھر پہنچیں۔ دوسرے ہی لمحے ایک ٹیکسی اگو کو لے کر ہسپتال کی جانب اور دوسری وجو لوگوں کو لے کر محلے کی جانب دوڑ پڑی۔

وہ گھر میں داخل ہوئیں تو زار و قطار رو رہی تھیں۔ میں جو کافی دیر سے کتابیں لیے وہیں ان کے گھر میں غیاث چچا کے ساتھ صحن میں بیٹھا تھا انہیں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر بُری طرح گھبرا گیا۔ غیاث چچا بھی بوکھلائے ہوئے سے انہیں تسلیاں دینے کی کوشش کرتے رہے، پھر سکینہ خالہ نے ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور سارا ماجرا اور اگو کے اس طرح جل کر زخمی ہونے کا واقعہ سنایا۔ میں راجہ کو لے کر ہسپتال کی طرف دوڑا جہاں بالے اپنے ابا کے ساتھ ہم سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اگو کی جلد بُری طرح سے جھلس گئی تھی اور وہ پٹیوں میں جکڑا ہوا بستر پر نہایت تکلیف کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

ظفر بہت دنوں سے وجو کے ہاتھوں عدالت میں ملی بے عزتی اور شرمندگی کا بدلہ چکانے کی تاک میں تھا اور اسی لیے وہ پچھلے کئی ہفتوں سے محلے کے آس پاس کسی دوست کی گاڑی میں چہرہ چھپائے ٹوہ لیتا رہتا تھا کہ اگر کبھی وہ باہر نکلیں تو وہ ان کے چہرے کو ہمیشہ کے لیے داغدار کر کے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکے، وہ جانتا تھا کہ وہ کا گھر سے اکیلے نکلنا تو ناممکن ہی ہے لیکن پھر بھی وہ اُسی مستقل مزاجی سے محلے کے چکر کاٹتا رہا کیونکہ یہ انتقام ہی اب اس کی زندگی کا واحد اور آخری مقصد رہ گیا تھا۔ وہ کی وجہ سے سارے شہر میں اس پر تھو تھو ہوئی تھی اور اب تو اس کے آوارہ اور

بدچلن جواری دوست بھی اُسے طعنے دے دے کر ہنستے تھے کہ جس بیوی کو بھیگی بلی بتاتا تھا، وہ تو ایسی شیرنی نکلی کہ بھری عدالت میں ظفر کی عزت اتار گئی۔ اور یہ طعنے رات بھر ظفر کا خون اُبالتے رہتے تھے۔ اسی لیے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ جہاں کہیں بھی ڈھو دیکھیں، وہ ان کا چہرہ بگاڑ دے گا اور اسی نیت سے وہ یہ تیزاب کی بوتل بھی ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ لیکن قدرت ایک بار پھر اس کے آڑے آئی اور تیزاب اُگو کا مقدر بن گیا، ظفر نے جب ڈھو کی طرف تیزاب اُچھالا تھا تو اسے بیک وقت دو چیخیں سنائی دی تھیں۔ ایک تو اس ٹیکسی والے کی جو نہ جانے بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا تھا اور دوسری ڈھو کی۔ لہٰذا اسے مکمل یقین نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے زیادہ نقصان کسے ہوا ہے کیونکہ دوسرے ہی لمحے اسے وہاں سے فرار ہونا پڑا تھا۔

اُگو کا بیان لینے کے لیے پولیس تو گھنٹہ بھر بعد ہی ہسپتال پہنچ گئی تھی لیکن اُگو کو اگلے دن ہی ہوش آیا۔ ملک ریشم جواب ہمارے علاقے کا ڈی۔ ایس۔ پی ہو چکا تھا اس نے اُگو کا بیان تو لے لیا لیکن ظفر کی تلاش میں چھاپے وہ گذشتہ آدھی رات سے ہی مار رہا تھا۔ غیاث چچا نے خود تھانے جا کر اسے ساری تفصیل بتا دی تھی لیکن ان کی درخواست پر ڈھو کا نام کیس کی تفصیل میں درج نہیں کیا گیا تھا، غیاث چچا اب مزید عدالتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اس لیے ملک ریشم خان نے صرف اُگو کے بیان پر ہی انحصار کیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ ایک دفعہ ظفر اس کے قابو آ جائے تو پھر عدالت کے سامنے اُسے اُگو سے شناخت کروا کر اس کا کچھ بندوبست کرے گا۔ کیونکہ خوش قسمتی سے ڈھو کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی اور مقدمے کا مدعی خود اُگو بھی بن سکتا تھا۔ لیکن ظفر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ پایا تھا۔ ملک نے اس کے ہر ممکن ٹھکانے پر خفیہ کے بندے بھی لگا دیئے تھے اور اس کے کچھ دوستوں کو گرفتار بھی کیا تھا لیکن ان سب کا ایک ہی بیان تھا کہ ظفر گذشتہ شام سے ہی غائب تھا۔ کچھ جواریوں نے یہ شکایت بھی کی کہ کل شام ظفر انتہائی جلدی میں ان سب کے پاس آیا اور سبھی سے ہزاروں روپے کی رقم دو دن کے لیے ادھار کے نام پر لے گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ظفر لمبے عرصے کے لیے شہر سے غائب ہونے کے ارادے سے جتنی رقم دوستوں سے اینٹھ سکتا تھا، وہ ساری سمیٹ کر بھاگ گیا تھا۔

اُگو کو ہسپتال کے وارڈ میں پڑے 24 چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے، وہ آنکھیں بند کیے اپنے جسم پر گزرتی اس بے انتہا اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس کے روئیں روئیں میں انگارے سے بھر رہی تھی۔ دفعتاً اسے اپنے چہرے پر کسی قطرے جیسی چیز کے گرنے اور پھر نمی کا احساس ہوا، اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور پھر سکتے اور حیرت سے آنکھیں بند نہیں کر پایا، غیاث چچا اس کے سرہانے کھڑے تھے اور ان کی آنکھ سے نکلتا پانی اُگو کے چہرے کو دھو رہا تھا۔ چہرے کو ہی کیا..... اُگو کو تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے غیاث چچا کے آنسوؤں کے وضو سے ہی آج اس کے تن اور من پر لگی گناہوں کی ساری کالک دُھل جائے گی۔

اُگو ان سے کچھ کہہ نہیں پایا اور اس مجبور باپ کے آنسوؤں نے اُسے بھی اپنی آنکھوں کا نمکین پانی بہانے پر مجبور کر دیا۔ کیسی عجیب بات تھی، وہ دونوں شخص آج مل کر رو رہے تھے، جن میں سے ایک دوسرے کی زندگی کی بربادی کا سارا سامان کر گیا تھا۔ دوسرا اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا اور آج اسی پہلے لٹیرے کے غم اور تکلیف میں آنسو بہا رہا تھا جس نے کل اس کی متاعِ حیات کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ کیسا لٹیرا تھا اور یہ لُٹ جانے والا بھی کیا کمال تھا۔

اُگو کو ہسپتال سے فارغ ہونے میں تقریباً تین ماہ سے بھی کچھ زیادہ کا عرصہ لگ گیا لیکن تیزاب کے وہ داغ اس کے جسم سے کبھی نہیں مٹ پائے۔ لیکن داغ کب تھے، یہ تو اس کے لیے وہ چمکتی مہریں تھیں، جنہیں وہ اپنے بازوؤں اور سینے پر..... کسی جنگ میں ملے تمغوں کی طرح سجائے

اب ساری دنیا کے سامنے فخریہ جا سکتا تھا کہ دیکھ لو یہ ایک گناہ گار شخص کا وہ کفارہ ہے جسے تقدیر نے اسی جہاں میں اس کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔

ظفر کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل پایا تھا۔ ڈوآپی کا گھر سے کہیں باہر آنا جانا بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب میرے بی اے کا نتیجہ نکل آیا اور میں مقابلے کے امتحان کے فارم بھی جمع کروا کر آ گیا۔ جس دن میرا پہلا پرچہ تھا اس دن صبح سویرے میں ڈوسے ملنے گیا۔ وہ صحن میں ہی جائے نماز پر بیٹھیں دعا کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا کہ "اگر صرف دعاؤں سے ہی مقابلے کے امتحان پاس ہونا ہوتے تو ہماری مسجد کے مولانا صاحب کے چاروں لڑکے سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہوتے۔" انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا اور مجھے نظروں نظروں میں ہی گھور کر دیکھا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر بنا کچھ بولے دعا ختم کر کے مجھ پر زور سے پھونک دیا۔ لیکن میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ میرے لیے تو سب سے بڑی دعا خود وہ تھیں، ان کا چہرہ تھا، جسے دیکھ کر میں اپنی زندگی کے ہر امتحان کا سامنا کرتا تھا اور اپنی اسی "دعا" کی بدولت ہی میں آج تک زندگی کے ہر امتحان میں سرخرو بھی ہوا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ دنیا کی ہر دعا رد ہو سکتی ہے لیکن میری یہ "دعا" کبھی نامراد پلٹ کر واپس نہیں آ سکتی۔

پہلی تعبیر

ٹرین تیزی سے بل کھاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور ایک زوردار سیٹی بجا کر دھیرے دھیرے جھٹکے لیتی ہوئی رُک گئی۔ ائیر کنڈیشنڈ سلیپر کی بوگی کے سٹاپ پر ایک سپاہی حوالدار اور ایک ڈرائیور مستعد کھڑے اپنے افسر کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر آوارہ سے لڑکوں کا ایک پورا گروہ کا گروہ ہاتھ میں موتیے، گیندے اور گلاب کے ہار لیے انتظار کر رہا تھا اور انہوں نے اس قدر دھما چوکڑی مچا رکھی تھی کہ حوالدار نے انہیں کئی بار خشمگیں نگاہوں سے گھورا تھا لیکن مجال ہے کہ اُن پر اُس کی اِس ''گھوری'' کا کوئی اثر ہوا ہو۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہی حوالدار اور ڈرائیور مستعد ہو گئے۔ بوگی کا دروازہ کھلا اور دونوں نے کھٹ سے نئے آنے والے صاحب کو پولیس والوں کا کڑک سلیوٹ پیش کیا اور اس کی جانب بڑھے لیکن یہ کیا اس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر سے ملتے، اسی لوفر لڑکوں کے گروہ نے ان کے صاحب پر بلّہ بول دیا اور چیختے چلاتے ان کے صاحب کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن اُن کا صاحب تو خود ہی بڑھ کر ان سے لپٹ گیا تھا۔ حوالدار اور ڈرائیور دونوں ہی کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا تھا۔

سب سے پہلے راجہ نے زوردار نعرہ لگایا تھا۔ ''وہ رہا آدمی'' پھر بالے چلایا۔ ''وہ آیا ہمارا شہزادہ'' پھر نھو کی پتلی سی آواز اُبھری۔ ''ارے یار خدا قسم..... یہ تو اپنا آدمی ہے۔'' کچھ ہی دیر میں وہ سارے ٹرین سے نیچے اترنے سے پہلے ہی مجھ سے شہد کی مکھیوں کی طرح چپک چکے تھے۔ میں سول سروس اکیڈمی سے اپنی ٹریننگ ختم کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے شہر پہنچا تھا جہاں میری انڈر ٹریننگ آفیسر کی حیثیت سے پہلی پوسٹنگ ہوئی تھی۔

اچانک میری نظر اپنے اسٹاف کے دو جوانوں پر نظر پڑی۔ میں نے ان سب کو خاموش کروا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ دونوں نے مجھے سلیوٹ کیا، اور بتایا کہ انہیں (S.P) ایس۔ پی ملک ریشم خان صاحب نے بھیجا ہے تا کہ وہ میرا استقبال کر سکیں اور ان کے دفتر تک میری رہنمائی کر سکیں۔ میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ یہ میرا اپنا شہر ہے اور ایس۔ پی صاحب کے دفتر کے بارے میں میں جانتا ہوں لہٰذا وہ بے فکر ہو کر واپس جائیں میں کچھ دیر میں خود ہی ایس۔ پی آفس پہنچ جاؤں گا۔ وہ دونوں مجھے سلیوٹ کر کے پلٹ گئے۔ بالے نے انہیں میرا سامان بھی نہیں اٹھانے دیا اور خود ہی میرا سامان اٹھائے وہ سب میرے ساتھ ہی اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

امی اور ابا سے مل کر میں دو گھڑی کے لیے جو کے گھر کی جانب دوڑا۔ وہ صحن میں ہی بے چینی سے ٹہل رہی تھیں، جتنے عرصے میں اکیڈمی میں ٹریننگ کر رہا تھا وہ راجہ سے میری لحہ بہ لحہ کی خبر لیتی رہتی تھیں اور راجہ کے خطوط میں ان کی جانب سے کہی ہوئی باتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔

انہیں پتہ تھا کہ آج میں فیلڈ ٹریننگ کے لیے اپنے ہی شہر میں تعینات ہو کر آ رہا ہوں۔ اسی لیے ان کے ساتھ ساتھ سکینہ خالہ اور غیاث چچا

بھی میری راہ تک رہے تھے۔ ان سبھی نے میرا استقبال اسی طرح کیا جیسے کوئی اپنا کسی اپنے کا کر سکتا ہے۔ غیاث چچا مجھے بہت دیر تک گلے لگا کر میری کمر تھپکاتے رہے اور پھر جب مجھ سے جدا ہوئے تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں ان کے احساسات سمجھ سکتا تھا۔ انہوں نے کبھی ایسی ہی کسی کامیابی کا خواب اپنی وجیہہ کے لیے بھی دیکھا تھا۔ لیکن افسوس مقدر نے وجو کا ساتھ نہیں دیا، لیکن آج اُنہی کی بیٹی کا دیکھا ہوا سپنا میں نے پورا کر دکھایا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آج خوشی کے آنسو تھے کیونکہ میری یہ کامیابی بھی تو وجو کی محنت کے بدولت ممکن ہوئی تھی۔ میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی کہ آج یہ مان صرف میرا نہیں، ان کا اور وجو کا بھی تو ہے۔

اس دن میں نے وجو کے ملیح چہرے پر ایک عرصے کے بعد مکمل سکون کی لہر دیکھی۔ ایسا سکون جو کسی ناخدا کے چہرے پر اس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ اپنی ڈوبتی کشتی کو طوفانوں سے بچا کر مسافروں سمیت خیریت سے ساحل پر لگا دیتا ہے۔ سکینہ خالہ اور غیاث چچا ایک طرف ہوئے تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔

"ہاں تو اے۔ ایس۔ پی عباد خان صاحب..... کیا کہا تھا آپ نے..... اگر دعاؤں سے ہی مقابلے کے امتحان پاس ہوا کرتے تو ہماری مسجد کے مولانا کے تمام بچے سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہوتے..... ہاں.....؟۔ تو اب کیا کہتے ہو؟ میری مانو تو جاتے ہوئے مولانا صاحب سے ملتے ہوئے انہیں بھی اپنا یہ سدا بہار مشورہ دیتے جانا....." اچھا ہے کچھ اور لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔"

وجو کی اس بات پر ہم سبھی بے اختیار ہنس پڑے۔ ان کے گھر سے نکلتے نکلتے میں نے پھر ان سے کہا کہ میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں لیکن شرط صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب بھی اپنے بچوں کے لیے وجو سے ہی دعا کروائیں۔ وجو مسکرا کر بولیں کہ "بسر و چشم۔ لیکن محنت انہیں بھی آدمی جیسی ہی کرنی ہوگی۔"

کچھ دیر بعد میں ایس۔ پی ملک ریشم خان کے دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا اپنی جوائننگ رپورٹ انہیں پیش کر رہا تھا۔ میں انہیں بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا اور میرے سامنے ہی وہ ترقی کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے انسپکٹر سے ایس۔ پی کے عہدے تک پہنچے تھے۔ جب ان کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے انہیں سیلوٹ کر کے "اے۔ ایس۔ پی انڈر ٹریننگ عباد خان رپورٹنگ سر" کہا تو انہوں نے بڑی گرم جوشی سے میرے سلام کا جواب دیا اور اُٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ مجھے بھی اچھی طرح پہچانتے تھے اور وجو کے کیس کے دوران محلے میں آتے جاتے انہوں نے کئی بار مجھے دیکھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ بچپن میں ہم سب محلے کے بچے ان کا نام سُن کر ہی بھاگ جایا کرتے تھے تو وہ بہت ہنسے۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ وہ اوپر سے جس قدر سخت گیر دکھائی دیتے تھے، اندر سے اُسی قدر شفیق تھے، لیکن مجرموں کے لیے ان کا نام ہی کافی تھا، اور جرم کے معاملے میں وہ کوئی نرمی برتنے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے تفصیل سے مجھے میرے زیرِ اختیار علاقے اور ان کیسوں کی تفصیل بتائی، جس میں مجھے ان کی معاونت کرنا تھی، آخر میں اشتہاری ملزمان کی فہرست کی باری آئی اور میں تیسرے ہی نام پر اس زور سے چونکا کہ میرے ہاتھ میں پکڑے کافی کے مگ سے کافی چھلکتے چھلکتے بچی۔ وہ ظفر کا نام تھا۔ ایس۔ پی صاحب نے بھی میری اس بدلتی کیفیت کو محسوس کر لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس نام سے ہم سب کا پرانا تعلق ہے۔ انہوں نے مجھے ایک اور چونکا دینے والی خبر بھی سُنائی کہ ان کی مخبری کے مطابق ظفر گزشتہ ایک ہفتے سے اسی شہر میں موجود ہے۔ لیکن اُس نے اپنا ٹھکانہ

بدل لیا ہے اور فی الحال اس کے نئے ٹھکانے کے متعلق کسی کو علم نہیں ہے۔ ہمارے مخبروں میں بھانت بھانت کے لوگ شامل ہوتے تھے اور یہ تازہ مخبری بھی ایک پرانے جواری نے کی تھی جو گزشتہ ہفتے ہی ظفر کے ہاتھوں اپنی ایک لمبی رقم سے جوئے کے دوران محروم ہو چکا تھا۔

ظفر کی شہر میں آمد کی اطلاع نے جہاں ایک جانب میرے رگ و پے میں بجلیاں سی بھر دی تھیں، وہیں مجھے کافی متفکر بھی کر دیا تھا۔ میں نے اسی دن ایس۔ پی صاحب سے درخواست کر کے ایک دو سادہ لباس والے محلے کے ارد گرد تعینات کروا دیئے تا کہ اگر ظفر اس جانب آنے کی کوشش کرے تو وہیں دھر لیا جائے۔

میں نے غیاث چچا کو بھی احتیاطاً فون کر دیا کہ وجو کو کہیں آنا جانا ہو تو وہ مجھے بتا دیا کریں۔ غیاث چچا نے مجھ سے تفصیل نہیں پوچھی لیکن شاید وہ بھی کچھ متفکر ہو گئے تھے۔ اور فکر کے یہ رنگ شام کو مجھے تب نظر آئے جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ میں نے انہیں شہر میں ظفر کی آمد کے بارے میں تو نہیں بتایا بس یونہی سرسری سا تذکرہ کر دیا کہ یہ روزمرہ کی احتیاط ہے اور کچھ نہیں۔ پتہ نہیں میری اس بات سے ان کی تسلی ہوئی یا نہیں لیکن سکینہ خالہ کی فکر اور بڑھ گئی اور انہوں نے وجو کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً اپنے دل کی بات پھر غیاث چچا کے سامنے رکھ دی کہ اس طرح وہ اپنی جوان بیٹی کی پل پل حفاظت کب تک کر پائیں گے؟ انہیں یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ وجو تیس ۳۰ کے ہندسے کو چھونے لگی ہیں اور ایک آدھ سال اور گزرا تو شاید لوگ اُن کے گھر کا راستہ ہی بھول جائیں۔ آج کل کنواریوں کو پلٹ کر کوئی نہیں پوچھتا اور وجو تو پھر.....'' لیکن غیاث چچا نے سکینہ خالہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہیں جھڑک کر روک دیا۔ لیکن یہ بات غیاث چچا بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ سکینہ خالہ کے خدشات بے جا نہیں ہیں۔ لیکن ایک بار وہ اپنی ایسی ہی ایک جلد بازی کی وجہ سے اپنی بیٹی کے دامن میں انگارے بھر کر اسے ظفر جیسے شخص کے جہنم میں جھونک چکے تھے لہٰذا دوبارہ وہ اپنا ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا چاہتے تھے۔ اور پھر بات صرف انہی کی مرضی اور اجازت کی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی، اب تو وجو سے ایسی کسی بات کا تذکرہ کرنا بھی محال تھا۔ اور ان کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ان کے دل کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچانا چاہتا ہو یا ایسی کوئی بات کر کے ان کے پرانے زخم ادھیڑنا چاہتا ہو۔ لیکن سکینہ خالہ کے اندر وجو کی ایک بہت گہری اور سب سے پکی سہیلی بھی تو رہتی تھی، اس لیے جو بات ماں کی زبان سے نہیں نکل پاتی تھی، اسے اس وقت وہ سہیلی وجو کو منتقل کر دیتی تھی، جب کبھی دونوں سہیلیاں سر جوڑ کر بیٹھا کرتیں لیکن ایسے میں وجو کا اپنی اس سہیلی کو دیا گیا جواب بھی صرف ایک لمبی چپ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وجو اپنی اس سہیلی کی ہر تشویش اور ہر خدشے سے آگاہ تھیں لیکن وہ شاید اپنے دل اور ذہن کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس موضوع پر بند کر چکی تھیں۔ کیونکہ اس عمر میں ہی وہ یکے بعد دیگرے اتنے زیادہ تلخ تجربوں سے گزر چکی تھیں کہ یہ بھی انہی کی ہمت تھی کہ وہ ابھی تک اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ میں اسی لیے نہیں چاہتا تھا کہ ظفر کی شہر میں موجودگی کی خبر سنا کر انہیں مزید پریشان کروں۔ لیکن پریشانیوں سے تو ہم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا، ہم ایک کھڑکی بند کرتے تھے تو وہ دوسرے روشن دان سے اندر جھانکنے لگتی تھیں۔ ایک درز پر قفل لگاتے تھے تو وہ دوسری جھری کھول کر ہمارے من کے اندر کود پڑتی تھیں۔ اُس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

ریحان صاحب کی چھوٹی بیٹی فائزہ کی سالگرہ تھی اور دونوں بچے خود اپنے پاپا کے ساتھ خصوصی طور پر اپنی اُستانی کی ساری فیملی کو مدعو کرنے کے لیے ان کے گھر آئے تھے۔ غیاث چچا نے وجو کے سامنے تو ان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ریحان

صاحب کو میری ہدایت کے بارے میں بتا دیا کہ میں نے انہیں وجو کی نقل و حرکت محدود رکھنے کے لیے کہا ہے۔ ریحان صاحب نے فوراً اس کا حل بھی غیاث چچا کو بتا دیا۔ انہوں نے غیاث چچا ہی کے ہاں میرے نام کا دعوت نامہ بھی لکھ کر چھوڑ دیا کہ ''جس نے نقل و حرکت محدود کرنے کی ہدایت کی ہے، وہ خود ہی آپ سب کو لے کر ٹھیک چار بجے میرے غریب خانے پہ حاضر ہو جائیں۔''

غیاث چچا نے مجھے دفتر فون کر کے ساری تفصیل بتا دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جمعرات کو فاری بھیا اپنے آسٹریلیا والے پڑھائی کے وظیفے کے سلسلے میں دو سال کے لیے پہلے کراچی اور پھر وہاں سے آسٹریلیا بذریعہ ہوائی جہاز سفر کے لیے روانہ ہو رہے ہیں لہٰذا میں انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر وہاں سے سیدھا ریحان صاحب کے گھر آ جاؤں گا۔ البتہ انہیں لیجانے کے لیے میں اپنی سرکاری گاڑی بھیج دوں گا لہٰذا وہ اُسی میں ریحان صاحب کے گھر پہنچ جائیں۔

جمعرات کو میں نے فاری بھیا کو بمشکل گھر سے نکالا ورنہ ان کی فلائٹ ہی رہ جاتی۔ امی کی دُھونیاں اور عمارہ کے امام ضامن ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ امی کا بس چلتا تو وہ بھیا کے ساتھ ہی ایک مستقل دُھونی ان کے گلے میں ڈال کر بھیج دیتیں تاکہ ہوائی جہاز میں بھی انہیں مناسب دھواں ملتا رہے البتہ خود بھیا کا کھانس کھانس کر بُرا حال ہو چکا تھا۔ اُن کا وظیفہ بائی میں ریسرچ کے لیے ہوا تھا اور دو سال میں انہیں صرف دو مرتبہ عید پر ہی چھٹی مل سکتی تھی اس لیے ان کے گھر سے نکلتے نکلتے ماحول کافی افسردہ سا ہو گیا تھا۔ عمارہ کی منگنی خاندان میں ہی طے ہو چکی تھی لیکن رُخصتی کے لیے اس نے شرط یہی رکھی تھی کہ فاری بھیا کی واپسی کا انتظار کیا جائے گا، وہ بھی بھیا کے نکلتے نکلتے رو پڑی۔ مجھے تو ویسے بھی ایسے الوداع ہمیشہ روح کے اندر تک کاٹ دیتے تھے، میرا سارا بچپن ایسے الوداعی لمحوں اور آنسوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ اور مجھ سے زیادہ بھلا اس اذیت اور کرب کو کون محسوس کر سکتا تھا، جس سے اس وقت فاری بھیا گزر رہے تھے۔ ویسے بھی وہ کبھی گھر سے اتنے عرصے کے لیے دُور نہیں گئے تھے۔ وہ صرف امی کی وجہ سے خود پر قابو کیے ہوئے تھے ورنہ وہ تو عمارہ سے پہلے ہی رونے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ تو شکر ہوا ابا کا کہ ان کی ایک زوردار کھنکار نے عمارہ، بھیا اور امی تینوں کو ہی آخری ''وارننگ'' سنا دی ورنہ ان لوگوں کا صحن کے دروازے سے ہلنے کا کوئی پروگرام بنتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایئر پورٹ پر بھیا مجھ سے مل کر پلٹنے لگے تو میں نے پیچھے سے انہیں ہم دونوں کے بچپن کے انداز میں آواز دی۔ ''فاری بھیا.....'' وہ چونک کر پلٹے۔ میرے ہاتھ میں ہم دونوں کے بچپن کی وہی پسندیدہ ٹینس بال تھی، جو انہوں نے میرے کیڈٹ کالج جاتے ہوئے، ریلوے اسٹیشن پر میرے سامان میں رکھ دی تھی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں بھیگی نمی اُتر آئی۔ وہ پلٹ کر واپس آئے اور انہوں نے مجھ سے بال لے لی اور پھر اچانک ہی زور سے مجھے گلے لگا لیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلے رونے والے نہیں تھے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ ہم بھی کتنے عجیب بھائی تھے۔ جب کبھی ساتھ ہوتے تو لڑ لڑ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے تھے اور آج جب ایک بار پھر جُدا ہو رہے تھے تو ہمارے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہاز ہوا میں بلند ہو گیا اور میں بوجھل دل کے ساتھ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں تو خاصا اہتمام نظر آ رہا تھا۔ کافی مہمان آ چکے تھے اور اب بھی مزید آمد جاری تھی۔ شارق اور فائزہ اپنے دوستوں سے اپنی پیاری ٹیچر کا تعارف کروا کر وا کر تھک نہیں رہے تھے۔ میں

نے اچانک ڈھوکو برآمدے میں نکلتے دیکھا تو میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ برآمدے میں ڈھلتی شام کے ملگجے اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی رنگین بتیوں کی لڑیاں جگمگا رہی تھیں اور ان روشنیوں کے درمیان ڈھوخود بھی ایک چمکدار ستارہ ہی تو دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے گہرے سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور کانوں میں اُسی مناسبت سے ہلکے سے فیروزی موتیوں والے ٹاپس ڈال رکھے تھے۔ ضرور یہ سارا اہتمام ان کی سہیلی سکینہ خالہ نے کروایا ہو گا، ورنہ ڈھوکو میں نے کبھی اتنا اہتمام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی سادگی ہی اتنی دلفریب اور پُر وقار تھی کہ انہیں ایسے کسی مصنوعی سہارے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہوں نے برآمدے سے ہی مجھے دیکھ کر دُور سے ہاتھ ہلایا۔ وہ حسب معمول بچوں کے ساتھ بچہ بنی ہوئی تھیں۔ میں نے مسکرا کر دور ہی سے ان کے لباس کو اور ان کے ہلکے سے میک اپ کی اشارے سے تعریف کی اور بچپن کی طرح فضا میں ۱۰۰ میں سے پورے سو یعنی ۱۰۰/۱۰۰ سو بٹہ سو کا نشان بنایا۔ ڈھو جھینپ سی گئیں اور ہنس پڑیں۔ بہت پہلے جب میں کیڈٹ کالج بھی نہیں گیا تھا اور اپنے اردو میڈیم پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو جب کبھی میں اپنی تختی بہت اہتمام سے لکھ کر ڈھوکو لے جا کر دکھاتا تو وہ یونہی فضا میں ۱۰۰/۱۰۰ کا نشان بنا کر میری خوش خطی کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ اور آج تو اگر میرا بس چلتا تو میں ہزار میں سے ہزار نمبر بھی انہیں دینے سے نہ چوکتا۔

اتنے میں ریحان صاحب کی امی اپنے پوتے پوتیوں سمیت باہر برآمدے میں نکل آئیں اور انہوں نے پیار سے ڈھو کے سر پر ہاتھ پھیرا، شاید بچے اُن کا دادی سے تعارف کروا رہے تھے، لیکن جب میں ان سب کے قریب پہنچا تو میرے کان میں فائزہ کا صرف آخری جملہ ہی پڑ سکا۔ وہ اپنی دادی سے لپٹ کر کہہ رہی تھی۔

"دادو آپ ٹیچر سے کہتی کیوں نہیں کہ وہ ہماری ممی بن جائیں۔" میں نے ڈھو اور ڈھو نے مجھے بوکھلا کر دیکھا۔

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

بچپن کا دسمبر

اب جانے بچوں کے دل میں یہ بات کہیں پہلے سے ہی دبی تھی یا پھر اُسی محفل کے ہنگامے میں ان کے دلوں میں یہ خواہش گھد بد ائی تھی، لیکن ان کی اس بات پر ڈھو ایک دم سے ہی خاموش ہو کر اندر چلی گئیں، دادی نے بچوں کو جھڑکا کہ ایسا نہیں کہتے، آس پاس کچھ دیر چہ مگوئیاں ہوئیں پھر سب لوگ بھول بھال کر اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی لیکن ڈھو آپی کو پھر کسی نے محفل میں مسکراتے نہیں دیکھا۔ ریحان صاحب نے بھی ان کی اس خاموشی کو محسوس کیا لیکن انہیں اس چپ کی وجہ سمجھ نہیں آ سکی اور وہ پارٹی ختم ہونے تک کبھی غیاث چچا اور کبھی خالہ سے پوچھتے رہے کہ وہ اتنی سنجیدہ کیوں بیٹھی ہیں؟ لیکن کوئی بھی انہیں ان کی غیر موجودگی میں بچوں کے دل سے نکلی وہ بات نہیں بتا سکا۔

پارٹی ختم ہوئی تو ریحان صاحب ہمیں گیٹ پر رخصت کرنے کے لیے آئے۔ انہوں نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے وہاں آ کر ان کا مان بڑھایا۔ پھر انہوں نے خاص طور پر ڈھو کی جانب مڑ کر ان سے کہا کہ وہ خصوصی طور پر وجو کے ممنون ہیں کیونکہ شاید ڈھو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تب بھی وہ بچوں کی خوشی کے لیے یہاں تک آئیں۔ ہم سب ان سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر جلدی سے گاڑی ریورس کی۔ اتنے میں سڑک سے گزرتا ایک تانگہ جس نے ابھی ابھی ہمیں کراس کیا تھا، آگے جا کر یک دم رُکا جیسے کسی نے گھوڑے کی لگامیں اچانک ہی دوڑتے دوڑتے کھینچ لی ہوں۔

میں ایک دم ہوشیار ہو گیا اور ڈھو کے سامنے آ گیا، تانگے سے کوئی شخص کودا اور شور مچاتا ہوا ہماری جانب بھاگا، میری ساری حسیں ایک دم ہی بیدار ہو گئیں، پھر غیاث چچا کی آواز میرے پیچھے سے اُبھری ''ارے..... یہ تو اپنا کرمو ہے۔'' غیاث چچا ہنستے ہوئے آگے بڑھے اور کرمو کو گلے لگا لیا۔ ہاں، وہ کرمو بابا ہی تھا۔ ڈھو آپی کے بچپن سے لے کر جوانی تک انہیں اپنے تانگے میں اسکول اور کالج تک چھوڑنے والا کرمو دین۔

ہم سب کو دیکھ کر کرمو بابا کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور وہ مجھے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ میں ہی وہ چھوٹا سا آدمی ہوں جو روزانہ اس کے تانگے کے پائیدان پر لٹک کر ڈھو کے گھر سے لے کر محلے کے پھاٹک تک بطور فیس جھولا لیا کرتا تھا۔ ڈھو بھی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پہ چھایا تمام تکدر بالکل ہی چھٹ گیا تھا۔ کرمو نے ڈھو کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بے شمار دعائیں دیں۔ اور ڈھو کے بچپن کو یاد کرتا رہا کہ وہ کتنی نفاست پسند تھیں کہ اگر تانگے کی سیٹ پر ذرا بھی گرد ہوتی تھی تو وہ بیٹھنے سے یکسر انکاری ہو جاتی تھیں اور جب تک خود کرمو یا فضلو بابا اس گرد کو کسی کپڑے سے صاف نہ کر دیتے تب تک وہ ''میم صاحب'' بنیں نیچے ہی ٹہلتی رہتی تھیں۔ غیاث چچا نے کرمو سے کہا کہ کبھی کبھار گھر کا چکر لگا جایا کرے، وہ بھی اس کا اپنا ہی گھر ہے۔ کرمو نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئے گا۔ گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے غیاث چچا سے کہا کہ وہ سکینہ خالہ کو لے کر گاڑی میں گھر چلے جائیں۔ میں اور ڈھو آج بچپن کی طرح کرمو کے تانگے پر گھر جائیں گے۔ سب نے حیران ہو کر میری جانب دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ ڈھو کے دل پر چھائے غبار کو دھونے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ کرمو نے خوشی سے وہی فقرہ لگایا، جو وہ ہمارے بچپن میں تانگے کو تیز دوڑانے کے لیے لگاتا تھا۔ غیاث چچا نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور مسکراتے ہوئے سکینہ خالہ کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈھو کو اشارہ کیا اور شاہی ادب و آداب کے ساتھ بولا۔

''آیئے شہزادی صاحبہ بگھی تیار ہے اور کوچوان کرمو آپ کا انتظار کر رہا ہے۔'' ڈھو نے مسکرا کر سر جھکا اور تانگے کی طرف چل دیں۔

''آدی..... تم بھی نا..... یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی ہاں.....؟''

''ارے بھئی آپ ٹھہریں اپنے ماں باپ کی لاڈلی اور اکلوتی..... آپ کا تو سارا بچپن ہی اس شاہی بگھی کی سواری میں گزرا ہے۔ جبکہ مجھ غریب کی کمر ابا کی پرانی سائیکل کی جمپوں اور اُچھل کود نے توڑ کر رکھ دی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج موقع ملا ہے تو ذرا ہم بھی اس سواری کا لطف اٹھا لیں۔'' ڈھو کچھ دیر مجھے مصنوعی غصے سے گھور کر دیکھتی رہیں اور پھر ہنس کر تانگے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے وہی نو دس سال کی ڈھو بن چکی تھیں جو اپنے کرمو بابا سے سارے راستے ضد کرتی تھی کہ تانگہ اور تیز چلائے، ڈھو سب بھول کر اب بھی کرمو سے وہی جملہ دُہرا کر ضد کر رہی تھیں۔

''اور تیز..... اور تیز نا کرمو بابا..... بھلا کوئی ایسے تانگہ چلاتا ہے۔''

اور کرمو بھی وہی پرانا کرمو بن چکا تھا جو اپنی ڈھو کے کہنے پر گھوڑے کو اور تیز دوڑائے جاتا تھا اور راستے میں زور زور سے ''ہو..... ہو'' کے نعرے بھی مارتا جاتا۔ تانگہ سڑک پر سرپٹ دوڑا جا رہا تھا اور آس پاس کے لوگ حیرت سے تانگے اور اس میں بیٹھی سواریوں کو دیکھ رہے تھے۔

تانگہ اب شہر کی دور دیہ درختوں سے گھری ٹھنڈی سڑک کی جانب مُڑ چکا تھا راستے میں ایک ٹھیلے پر گرم مونگ پھلیاں بھنتے دیکھ کر ڈھو پہلے کی طرح زور سے چلائیں۔

''آدی..... گرم مونگ پھلی۔''

میں بھی بچپن کی طرح ان کے حکم کی تعمیل میں تانگے سے کودا اور بھاگ کر اخبار کی بڑی بڑی تہہ نما پڑیوں میں گرم مونگ پھلی کے بھنے دانے، اُن کے اوپر بہت سا چٹ پٹا مصالحہ اور نیبو چھڑکوا کر بھاگتا ہوا دوبارہ تانگے میں آ بیٹھا، کرمو نے پھر ہنس کر زوردار نعرہ مارا ''ہو..... ہو۔'' پھر تو راستے میں جو بھی پھیری والا یا ٹھیلا آتا گیا، ڈھو یونہی چلاتی رہیں۔ ''آدی گزک والا۔'' آدی..... بھٹہ.....'' ..... ''آدی..... قلفی.....'' اور میں ہر بار اُسی چھوٹے آدی کی طرح بھاگ کر ان کو یہ سب لا کر دیتا رہا۔ جانے کتنی صدیوں بعد میں نے ڈھو کو یوں کھل کر ہنستے، قہقہے لگاتے سُنا تھا، ان کا چہرہ پھول کی طرح کھلے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں وقت کو وہیں روک دیتا۔ زمانے کی ہر ساعت کو اپنے اور ڈھو کے بچپن کے دسمبر میں ساکت کر دیتا۔

ہمیں یوں بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے دیکھ کر کرمو نے بھی تانگے کو سڑکوں پر ڈالے رکھا، اس روز تانگے پر بیٹھے بیٹھے میں نے اور ڈھو نے اپنے بچپن کو پھر سے جی لیا۔ ہمیں تب ہوش آیا جب دُور کسی شہر کے گھڑیال نے رات کے نو بجنے کا اعلان کیا۔ ڈھو نے کرمو سے کہا کہ تانگہ گھر کی طرف موڑ